وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے

جلد 7	شمارہ 09	ذیقعدہ 1434ھ	ستمبر 2013ء

ISSN 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: سعد حسن خان

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اختیر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام: انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرتعاون سترہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 400 روپے، قیمت فی شمارہ 40 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

www.hamditabligh.net

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس فوارچوک جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ چیز ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات	سورۃ المرسلات	3
2	بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات		5
3	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	6
4	تقسیم وراثت	مولانا محمد صدیق ہزاروی	7
5	نجات کی راہ	مقرر: انجینئر مختار فاروقی	18
6	اسلام اور سائنس (5)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین	32
7	سب سے بڑے ظالم شخص کے منفی کردار.....	انجینئر مختار فاروقی	39
	مدیر کے نام		61

ماہنامہ حکمت بالغہ میں قلمی تعاون کرنے والے حضرات کے مضامین معلومات کے تبادلے اور وسیع تر انداز میں خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے لیے چھاپے جاتے ہیں اور ادارے کا مضمون نگار حضرات سے تمام جزئیات میں اتفاق ضروری نہیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

﴿سورۃ المرسلٰت، آیات 16-33﴾

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ نُھْلِكِ الْاَوَّلِیْنَ O

کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کر ڈالا؟

ثُمَّ نُتْبِعُھُمُ الْاٰخِرِیْنَ O

پھر ان پچھلوں کو بھی ان کے پیچھے بھیج دیتے ہیں

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ O

ہم گنہگاروں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں

وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ O

اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّھِیْنٍ O

کیا تم کو ہم نے حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟

فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ O اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ O

(پہلے) اس کو ایک محفوظ جگہ میں رکھا ایک وقت معین تک

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ O

پھر اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی اچھا اندازہ مقرر کرنے والے ہیں

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ O

اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا O اَحْيَاءً وَّ اَمْوَاتًا O

کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ (یعنی) زندوں اور مردوں کو

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ O وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا O

اور اس پر اونچے اونچے پہاڑ رکھ دیے اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ O

اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ O

(اب) چلو اس چیز کی طرف، جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ O

(یعنی) چلو اس سائے کی طرف جس کی تین شاخیں ہیں

لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ O

نہ ٹھنڈی چھاؤں اور نہ لپٹ سے بچاؤ

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ O

اس سے آگ کی (اتنی بڑی) چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے محل

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ O

گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ O

اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ

أَتَدْرُوْنَ مَا الْعَضَهُ؟ نَقْلُ الحَدِیْثِ مِنْ بَعْضِ النَّاسِ اِلٰی بَعْضٍ لِیُفْسِدُوْا بَیْنَهُمْ

''کیا تم جانتے ہو کہ عضہ (چغلی) کیا ہوتا ہے؟ وہ ایک کی بات دوسرے تک اس لیے نقل کرنا ہے تا کہ ان کے آپس کے تعلقات خراب ہو جائیں۔'' (بیہقی، عن انس رضی اللہ عنہ)

اتَّقِ اللّٰهِ حَیْثُمَا کُنْتَ، وَأَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ

تو اللہ سے ڈرتا رہ جہاں کہیں بھی ہو اور (اگر تجھ سے کبھی) برائی (ہو جائے تو اس) کے بعد نیکی کر، تا کہ نیکی برائی کو مٹا دے اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آ۔ (ترمذی، عن ابی ذر رضی اللہ عنہ)

اِتَّقُوا الظُّلْمَ، فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ،

''ظلم سے بچتے رہو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کا ذریعہ ہوگا۔'' (مسند احمد، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

الجَامِعُ الصَّغِیْر فی احادیث البشیر والنذیر، للامام جلال الدین السیوطی رحمه الله

پاکستان میں حالیہ طوفانی بارشوں
اور سیلاب کے پس منظر میں

یااللہ پاکستان میں حالیہ طوفانی بارشیں، سیلاب اور ناگہانی مصیبتیں اگر تیرے علم کامل کے مطابق تیرا ہی فیصلہ ہیں تو ہم تیرے غضب اور ناراضگی سے تیری ہی پناہ چاہتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں۔

اور اگر یہ طوفانی بارشیں، سیلاب اور ناگہانی مصیبتیں تیرے علم کامل میں تیرے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے فرمان کے مطابق فتنۂ دجال کا حصہ ہیں کہ دجال جہاں چاہے گا بارش برسا دے گا اور جہاں چاہے گا خشک سالی پیدا کر دے گا تو ہم ان کے شر سے بھی تیری پناہ چاہتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ تو ان تمام ناگہانی مصیبتوں کا رُخ ان کے منصوبہ سازوں کے اپنے علاقوں، سرزمینوں اور آبادیوں کی طرف پھیر دے اور ہمیں ان کے شر سے محفوظ فرما۔

آمین ــــــ یا رب العالمین

انجینئر مختار فاروقی

تقسیمِ وراثت

مولانا محمدصدیق ہزاروی

وراثت کی تقسیم دین کے فرائض میں سے ہے مگر اکثر دیندار لوگ بھی اس سے غافل ہیں۔ ذیل میں ہم ایک مضمون معاصر جریدہ الجامعہ محمدی شریف، اگست 2013ء سے افادۂ عام کے لیے نقل کر رہے ہیں۔ صاحب مضمون کی طرف سے دی گئی بعض جزئیات سے من وعن اتفاق ضروری نہیں ہے۔ (ادارہ)

تقسیم وراثت: جب تک انسان اس دنیا میں زندگی گزارتا ہے اسے اپنی ذات، اہل و عیال، ضرورت مند رشتہ داروں اور معاشرے کے نادار افراد کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور مذہبی ورفاہی کاموں میں حصہ لینے کے لئے مال کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اسلام محنت اور کسب حلال کی تعلیم دیتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ أَطْیَبَ مَا أَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ، (جامع ترمذی جلداوّل صفحہ 214)

''بے شک تمہارا پاکیزہ کھانا وہ ہے جسے تم نے اپنی کمائی سے حاصل کیا''

اور پھر اسلام میں اس جائز طریقے سے حاصل کیے گئے مال کو اس کی ملکیت بھی قرار دیا گیا ہے کیونکہ ملکیت کے بغیر زکوٰۃ کی فرضیت، صدقہ فطر کا وجوب اور وراثت کا نظام کیسے ممکن ہے۔

میّت کا ترکہ: لیکن جب کوئی شخص اس دارِفانی سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی ضروریاتِ زندگی ختم ہوجاتی ہیں اور یہ مال اس کے ورثاء کے ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مَنْ مَاتَ وَعَلَیْهِ دَیْنٌ وَلَمْ یَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَیْنَا قَضَاؤُهُ، وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ (صحیح بخاری جلد2 صفحہ 997) ''جو شخص انتقال کر جائے اور اس پر قرض ہو اور

ادائیگی قرض کے لئے کچھ نہ چھوڑے تو اس کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے اور جو آدمی مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے۔'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میّت جو مال چھوڑتا ہے وہ اس کے ورثاء کا حق ہے اور وہ انہیں ملنا چاہئے لیکن تقسیم میراث سے پہلے میّت کے حقوق سے متعلق کچھ اُمور کی تکمیل ضروری ہے لہٰذا ان کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچے گا وہ وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

میّت کے مالی حقوق: میّت کے مالی حقوق تین ہیں:

(1) تجہیز وتکفین (2) قرض کی ادائیگی (3) وصیت کو پورا ادا کرنا

تجہیز وتکفین: میّت کو سنت طریقے کے مطابق کفن پہنانے کے لیے ایسا کپڑا خریدنا جس

قسم کا لباس وہ زندگی میں پہنتا تھا یعنی نہ تو بہت زیادہ قیمتی ہو اور نہ بالکل ہلکا اور گھٹیا ہو، قبر کی جگہ اور کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں بعض مقامات پر کارپوریشن یا انتظامیہ کو کچھ فیس ادا کرنا پڑتی ہے یہ تمام اخراجات، تجہیز وتکفین کے اخراجات شمار ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی میّت کے چھوڑے ہوئے مال میں سے ہوگی۔ ''میت کا کفن سنت'' مرد کے لئے تین کپڑے ہیں:

(1) لفافہ (ایک بڑی چادر) جو لمبائی میں پونے تین گز اور چوڑائی میں تقریباً ڈیڑھ گز تک ہو۔

(2) ازار (یہ بھی چادر ہے) جس کی لمبائی تقریباً اڑھائی گز اور چوڑائی ڈیڑھ گز تک ہو۔

(3) قمیص، اس کی لمبائی بھی ازار جتنی ہو، لیکن چوڑائی ایک گز بھی کافی ہے۔

عورت کے لئے کفن سنت ان تین کپڑوں کے علاوہ دو کپڑے یعنی ڈیڑھ گز کا دوپٹہ (خمار) اور دو گز کا ایک ٹکڑا (خرقہ) بھی ہوتے ہیں گویا عورت کے لئے کفن سنت پانچ کپڑے ہیں: (1) لفافہ (2) ازار (3) قمیص (4) خمار (5) خرقہ۔

نوٹ: کفن کی مکمل تفصیل، کفن پہنانے کا طریقہ اور میّت سے متعلق دوسرے مسائل سے آگاہی کے لیے راقم کی کتاب ''تجہیز وتکفین'' کا مطالعہ کیجیے۔

تنبیہ: میت کے ترکہ سے ایصالِ ثواب کی خاطر صدقہ دینا یا کھانا پکانا جائز نہیں البتہ اگر تمام وارث بالغ ہوں اور موجود بھی ہوں تو سب مل کر اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب یہ مال ان کی ملکیت ہے اور اگر ورثاء میں کوئی چھوٹا بچہ بھی ہو تو اس کی اجازت سے بھی ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ بچے کو

اجازت دینے کا کوئی اختیار نہیں۔اسی طرح اگر کوئی وارث موجود نہ ہو تو اس کے حصے سے بھی خرچ نہیں کیا جاسکتا۔لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ورثاء یا دوسرے رشتہ دار اپنے ذاتی مال سے ایصالِ ثواب کے لئے اہتمام کریں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو قرآن پاک پڑھ کر پانی پر ہی ختم شریف پڑھیں اور ایصالِ ثواب کرتے ہوئے میّت کی مغفرت کے لیے دُعا مانگیں، ایسا ہرگز جائز نہیں کہ میّت کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے مال کو ایصالِ ثواب کے نام پر دعوتوں میں اُڑا دیں۔

قرض کی ادائیگی: اسلام میں کسی اشد ضرورت کے بغیر قرض لینا جائز نہیں اور سرکارِ دو عالم ﷺ کسی مقروض کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھنے کا حکم دیتے اور اگر کوئی شخص میّت کی طرف سے قرض ادا کر دیتا تو آپ ﷺ اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے اس طرح آپ ﷺ بلا ضرورت قرض لینے سے باز رہنے کی ترغیب دیتے تھے۔لیکن بسا اوقات ضرورت کے تحت قرض لینا پڑتا ہے اس صورت میں اگر میّت کے ذمہ کچھ قرض ہو تو وصیت پر عمل درآمد اور تقسیم وراثت سے پہلے قرض ادا کیا جائے۔قرآن پاک میں ہے:

مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَا اَوۡ دَيۡنٍ (سورۃ النساء آیت 11)

''وصیت یا قرض (کی ادائیگی) کے بعد (وراثت تقسیم کی جائے)۔''

چونکہ قرض دوسروں کا حق ہے اور وصیت میّت کے ذاتی فائدے کے لئے ہے اس لئے قرض، وصیت پر مقدم ہے۔قرض کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ اگر قرض تجہیز و تکفین سے بچنے والی رقم سے کم ہو تو بات واضح ہے مکمل ادائیگی کر دی جائے، اگر قرض اور باقی مال برابر برابر ہیں تو تمام مال قرض میں چلا جائے گا، وصیت کو پورا کرنے یا تقسیم وراثت کی نوبت نہیں آئے گی۔اگر قرض زیادہ اور مال کم ہو تو باقی قرض یا تو قرض خواہ معاف کر دے یا اس کے رشتہ دار اپنی طرف سے ادا کریں اور قرض خواہ زیادہ ہوں اور مال کم ہو سب کا قرض ادا نہ ہو سکتا ہو تو تمام قرض خواہوں کا قرض تناسب سے ادا کیا جائے مثلاً ایک شخص کا قرض دس ہزار روپے اور دوسرے کا تین ہزار روپے جبکہ تجہیز و تکفین پر اُٹھنے والے اخراجات کے بعد باقی بچنے والی رقم ساڑھے چھ ہزار روپے ہے تو اب دس ہزار روپے والے قرض خواہ کو پانچ ہزار اور تین ہزار روپے والے کو ڈیڑھ ہزار روپے دیے جائیں اور باقی قرض معاف کر دیا جائے۔نوٹ: اگر میّت نے قرض کا اقرار کیا اور وہ دو قسم کا قرض ہے ایک وہ جو حالت صحت میں لیا اور دوسرا مرض الموت کی حالت میں۔تو صحت کی حالت میں لیا گیا قرض پہلے

ادا کیا جائے۔اس کے ادا کرنے کے بعد اگر مال بچ جائے تو دوسری قسم کا قرض ادا کیا جائے گا۔

وصیت: فوت ہونے والا شخص جب دیکھتا ہے کہ زندگی میں اس سے عملی کوتاہی ہوئی ہے تو وہ مالی عبادت کے ذریعے اس کوتاہی کا کچھ نہ کچھ ازالہ کرنا چاہتا ہے یا وہ کسی اچھے مقصد کے لئے کچھ نہ کچھ رقم دینا چاہتا ہے تو وہ وصیت کرتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اتنی رقم فلاں کو دے دی جائے۔ یہ وصیت فرض یا واجب نہیں بلکہ محض مستحب ہے۔

وصیت سے متعلق چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے:

(1) وارث کے لیے وصیت نہیں ہوسکتی۔سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا:اِنَّ اللّٰہَ أَعْطَی کُلّ ذِی حَقٍّ حَقَّہُ، اَلَا لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ (مسند احمد بن حنبل جلد 4 صفحہ 186)''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا۔سنو! وارث کے لئے وصیت نہیں ہوسکتی''

لیکن اس سے وہ وارث مراد ہے جس کو اس میّت کی وراثت سے حصہ مل رہا ہے اور اگر کسی دوسرے وارث کی وجہ سے یہ محروم قرار پاتا ہے تو اب اس کے لئے وصیت ہوسکتی ہے۔مثلاً پوتا بھی وارث ہے لیکن جب بیٹا موجود ہو تو پوتے کو وراثت نہیں ملتی لہٰذا اس کے لئے وصیت جائز ہوگی۔

(2) وصیت مالِ وراثت کے تیسرے حصے تک ہوسکتی ہے اس سے زائد نہیں۔

(3) اگر فوت ہونے والے کے ورثاء معاشی طور پر کمزور ہوں تو کسی کے لئے وصیت نہ کرنا بہتر ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں اپنا تمام مال وصیت کرنے کا خیال ظاہر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

الثُّلُثُ وَ الثُّلُثُ کَثِیرٌ اِنَّکَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَکَ أَغْنِیَاءَ، خَیْرٌ مِنْ أَنْ تَذَرَھُمْ عَالَۃً یَتَکَفَّفُونَ النَّاسَ، (صحیح بخاری ج2 صفحہ 846)

''تیسرے حصے کی وصیت کافی ہے بلکہ تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے۔ورثاء کو تنگ دست چھوڑنا کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں اس کی نسبت انہیں مال دار چھوڑنا بہتر ہے''

(4) اگر ورثاء مالی اعتبار سے ٹھیک ٹھاک ہوں لیکن کوئی نادار رشتہ دار بھی موجود ہو جو وارث نہ بنتا ہو تو اس کے لئے ضرور وصیت کرنی چاہیے یہ باعث ثوابِ عظیم ہے۔

(5) وصیت کسی اچھے مقصد کے لئے اور نیکی کے راستے پر خرچ کرنے کے لئے کی جائے

مثلاً کسی صحیح العقیدہ (سنی) دینی ادارے کی خدمت میں یہ رقم صرف ہو۔ بلکہ دیگر صدقات بھی برادری کو کھلانے کی بجائے صدقہ جاریہ کی صورت میں ایصالِ ثواب کریں یہ زیادہ بہتر ہے مثلاً مدرسہ یا مسجد بنوانا، پانی کے لئے کنواں کھدوانا یا دینی مسائل پر مشتمل کتب کی اشاعت میں تعاون کرنا صدقہ جاریہ ہے۔

نوٹ: کسی بدمذہب ادارے کو رقم دینا اس کو صرف ضائع کرنا ہی نہیں بلکہ گناہ کا باعث بھی ہے۔

تقسیم وراثت: میّت کی تجہیز وتکفین، قرض کی ادائیگی اور وصیت کو پورا کرنے کے بعد آخری مرحلہ باقی ماندہ رقم کو ورثاء کے درمیان تقسیم کرنے کا ہے۔

وراثت کی تقسیم سے متعلق مسائل کی تفصیل کی بجائے یہاں چند بنیادی باتیں عرض کی جائیں گی اور پھر ہمارے گھروں میں عام طور پر جو لوگ وارث بنتے ہیں ان کی مختلف صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کس کس وارث کا کتنا حصہ بنتا ہے اس کا خاکہ پیش کیا جائے گا۔ اگر کبھی ان صورتوں کے علاوہ کوئی صورت درپیش ہو تو کسی جید عالم دین سے رابطہ کیا جائے اور ان کے بتائے ہوئے شرعی طریقے کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے۔

ورثاء کی اقسام: ورثاء تین قسم کے ہیں: (1) اصحابِ فروض، جن کا حصہ شریعت نے مقرر کر دیا ہے۔ (2) عصبات، جن کا حصہ مقرر نہیں، اصحابِ فروض کا حصہ دینے کے بعد جو بچتا ہے وہ عصبات کو ملتا ہے۔ (3) ذوی الارحام، جو اصحابِ فروض اور عصبات کی عدم موجودگی میں وراثت پاتے ہیں۔

اصحابِ فروض: یہ کل بارہ ہیں: باپ، دادا، والدہ کی طرف سے بھائی، خاوند، بیوی، بیٹی، پوتی، والدہ، دادی، سگی بہنیں، باپ کی طرف سے بہنیں، والدہ کی طرف سے بہنیں۔

عصبات: یہ کل اٹھارہ ہیں: بیٹا، بیٹی (جب بیٹے کے ساتھ ہو ورنہ اصحابِ فروض میں شامل ہوتی ہے) پوتا (پڑپوتا یا اس سے نیچے) پوتی (پڑپوتی وغیرہ) باپ (جب اولاد نہ ہو یا صرف بیٹیاں ہوں) دادا، حقیقی بھائی، حقیقی بہن، باپ کی طرف سے بھائی، باپ کی طرف سے بہن، حقیقی بھائی کا بیٹا، باپ کی طرف سے بھائی کا بیٹا، حقیقی بھائی کا پوتا، باپ کی طرف سے بھائی کا پوتا، حقیقی چچا، سوتیلا چچا، حقیقی چچا کا بیٹا، حقیقی چچا کا پوتا، سوتیلے چچا کا بیٹا، سوتیلے چچا کا پوتا۔

نوٹ: یہاں سوتیلے چچا سے مراد میّت کے باپ کا اس کے باپ کی طرف سے بھائی مراد ہے۔

ذوی الارحام: ذوی الارحام سے میّت کے وہ رشتہ دار مراد ہیں جو نہ تو اصحابِ فروض ہیں اور نہ عصبات یعنی اُوپر ذکر کیے گئے رشتہ داروں کے علاوہ ذوی الارحام ہیں مثلاً ماموں اور خالہ وغیرہ۔

بعض ورثاء کی محرومی: بعض اصحابِ فروض کی موجودگی میں کچھ اصحابِ فروض محروم رہتے ہیں مثلاً میّت کا باپ موجود ہو تو دادا وراثت سے محروم ہوگا۔ اسی طرح بعض عصبات کی موجودگی میں کچھ دوسرے عصبات محروم ہوں گے مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتا وراثت سے محروم ہوتا ہے۔ اس طرح حصوں کی تقسیم میں بھی فرق پڑتا ہے مثلاً میّت مرد ہو اور اس کی اولاد بھی موجود ہو تو اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے اور اگر اولاد نہ ہو تو چوتھا حصہ ملے گا اور اگر عورت فوت ہو جائے اور اس کی اولاد بھی ہو تو خاوند کو چوتھا حصے ملے گا جب کہ عورت کی اولاد نہ ہونے کی صورت میں خاوند کو وراثت کا نصف حصہ ملے گا۔

ترکہ سے متعلق چند ضروری باتیں:

(1) ترکہ (وراثت) میں میّت کی زمین، مکان، زیورات، کپڑے، کتابیں اور سامان سب شامل ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز صدقہ کرنا چاہیں تو تمام وارثوں کا اتفاق ضروری ہے اور اگر ان میں کوئی چھوٹا نابالغ بچہ بھی ہو تو صدقہ کی جانے والی چیز کی قیمت لگا کر اس کے حصے کی رقم اسے دی جائے کیونکہ وہ صدقہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔ (2) میّت جس چیز کا مالک ہے وہ وراثت ہے چاہے اسے باپ دادا سے وراثت میں ملی ہو، خود کمائی ہو یا کسی نے تحفہ میں دیا ہو۔ (3) میّت اپنی زندگی میں جو چیز کسی وارث کو دے دے اس کے مرنے کے بعد وہ وراثت میں تقسیم نہیں ہوتی جیسے بیٹی کو جہیز دیا تو باقی وارثوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ (نوٹ: جہیز کی وجہ سے بیٹی وراثت سے محروم نہیں ہوگی) (4) اگر میّت نے کوئی چیز کرایہ پر دے رکھی ہو یا نفع اُٹھانے کے لئے دی ہو وہ بھی مال وراثت ہے اور ورثاء میں تقسیم ہوگی۔ (5) کوئی وارث موجود نہ ہو یا قیدی ہو تو وہ وراثت سے محروم نہ ہوگا اس کا حصہ محفوظ رکھا جائے۔ (6) اگر بیوہ عورت دوسری جگہ نکاح کر لے تو اس وجہ سے وہ خاوند کی وراثت سے محروم نہ ہوگی۔ (7) اگر کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح ہو گیا

اب رخصتی سے پہلے خاوند بیوی میں سے کوئی فوت ہوجائے تو ایک دوسرے کے وارث ہوں گے کیونکہ شریعت میں نکاح معتبر ہے رخصتی نہیں۔(8) اگر مرض الموت میں طلاق دی اور عورت کی عدت کے دوران خاوند کی موت واقع ہوگئی تو عورت وراثت میں سے اپنا حصہ وصول کرے گی۔ (9) دودھ کے رشتے سے وراثت ثابت نہیں ہوتی۔(10) کسی کو منہ بولا بیٹا بنانا (جسے لے پالک یا متبنّیٰ کہتے ہیں) تو وہ وارث نہیں ہوگا۔

تقسیم ترکہ سے متعلق چند بنیادی باتیں:

(1) میّت کے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو کچھ نہیں ملتا۔(2) میّت کے باپ کی موجودگی میں دادا وراثت سے محروم ہوتا ہے۔ (3) میّت کی اولاد ہو تو بیوی کو آٹھواں ورنہ چوتھا حصہ ملتا ہے۔ (4) میت (عورت) کی اولاد ہو تو خاوند کو چوتھا ورنہ نصف مال ملتا ہے۔(5) میّت کی ایک سے زائد بیویاں ہوں تو اولاد کی صورت میں آٹھواں ورنہ چوتھا حصہ ان سب میں برابر تقسیم ہوگا۔ (6) میّت کے لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو اصحابِ فروض کا حصہ دے کر باقی رقم ان میں یوں تقسیم کی جائے گی کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ملے گا۔(7) اگر میّت کا لڑکا نہ ہو بلکہ لڑکیاں ہوں اور ایک سے زیادہ ہوں تو اب لڑکیوں کو کل وراثت کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ (8) اگر ایک لڑکی ہو تو اسے کل مال وراثت کا نصف حصہ ملے گا۔ (9) میّت کے باپ یا دادا کی موجودگی میں اس کے بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔(10) میّت کے باپ یا دادا کی موجودگی میں اس کے بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔(11) میّت کی اولاد کی موجودگی میں بھی اس کے بھائی بہنیں محروم ہوں گی۔

(12) مالِ وراثت وہ مال ہوتا ہے جو تجہیز و تکفین اور قرض سے بچ جائے اس میں سے تہائی حصے تک وصیت نافذ ہوگی، باقی مال ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ (13) تقسیم وراثت کے سلسلے میں میّت کے چھوڑے ہوئے تمام مال یعنی دُکان، مکان، زمین اور نقدی وغیرہ سب کو تقسیم کرنا ہوگا۔ دُکان و مکان اور ساز و سامان کی کل مالیت کا اندازہ لگا لیا جائے اور پھر اگر کوئی وارث مکان یا دُکان رکھنا چاہے تو اپنے حصے کی رقم نکال کر باقی رقم دوسرے ورثاء کو دے دے۔(14) باپ، ماں، خاوند، بیوی، بیٹا اور بیٹی ہر حال میں وارث ہوتے ہیں۔

تقسیم ترکہ کی چند صورتیں: ترکہ کی تقسیم ورثاء کے مطابق ہوتی ہے اور اس بات کا علم کسی شخص کے فوت ہونے پر ہوتا ہے کہ اس نے کون کون سے وارث چھوڑے ہیں چنانچہ ان ورثاء کو شرعی تقسیم کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ اس مضمون میں چند ایسی صورتوں کو سامنے رکھ کر تقسیم کا نقشہ دیا گیا ہے جو عام طور پر ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ اگر کسی وقت ان سے الگ کوئی صورت پیش آئے تو کسی جید عالم دین سے رابطہ قائم کر کے وراثت تقسیم کریں۔

صورت نمبر 1: بیوی، ماں، باپ، بیٹے اور بیٹیاں: اگر میّت نے ایک بیوی، ماں، باپ اور کچھ بیٹے اور بیٹیاں چھوڑیں تو وراثت کی تقسیم یوں ہوگی کہ بیوی کو آٹھواں حصہ ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی رقم لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان یوں تقسیم کریں گے کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ملے گا۔ مثلاً کل ترکہ چوبیس ہزار روپیہ ہے تو میّت کی بیوی کو تین ہزار ماں اور باپ کو چار چار ہزار روپیہ ملے گا اور باقی تیرہ ہزار روپے بچ جائیں گے۔ اب اگر اس کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہے تو لڑکے کو آٹھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپے چھیاسٹھ پیسے اور لڑکی کو چار ہزار تین سو تینتیس روپے تینتیس پیسے دیے جائیں گے اور اگر دو لڑکے ایک لڑکی ہو تو لڑکی کو دو ہزار چھ سو روپے اور ہر لڑکے کو پانچ ہزار دو سو روپے ملیں گے اور اگر ایک لڑکا دو لڑکیاں ہوں تو لڑکے کو چھ ہزار پانچ سو روپے اور ہر لڑکی کو تین ہزار دو سو پچاس روپے دیے جائیں گے۔ بیوی 1/8 (3)، باپ 1/6 (4)، ماں 1/6 (4)، لڑکے اور لڑکیاں 13۔

صورت نمبر 2: خاوند، ماں، باپ، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں خاوند کو چوتھا، ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی رقم بیٹیوں اور بیٹوں میں حسب ضابطہ تقسیم ہوگی (ضابطہ یہ ہے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا ملتا ہے)

خاوند 1/4 (3)، ماں 1/6 (2)، باپ 1/6 (2)، لڑکے اور لڑکیاں 5 کل: 12

صورت نمبر 3: بیوی، باپ، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں بھی بیوی کو آٹھواں حصہ اور باپ کو چھٹا حصہ ملے گا جبکہ باقی رقم بیٹوں اور بیٹیوں میں اسی ضابطہ کے مطابق تقسیم ہوگی جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بیوی 1/8 (3)، باپ 1/6 (4)، بیٹے اور بیٹیاں 17، کل تعداد: 24

صورت نمبر 4: بیوی، ماں، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں بھی تقسیم کا وہی

طریقہ ہے جوصورت نمبر3 میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہاں باپ کی جگہ ماں ہے۔

بیوی1/8(3)،ماں1/6(4)، بیٹے اور بیٹیاں17،کل تعداد:24

صورت نمبر5: بیوی، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا اور باقی سات حصے بیٹوں اور بیٹیوں میں حسب ضابطہ تقسیم ہوں گے۔ بیوی1/8(1) بیٹے اور بیٹیاں7 کل تعداد:8

صورت نمبر6: بیوی اور بیٹے: اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا اور باقی سات حصے تمام بیٹوں میں برابر تقسیم ہوجائیں گے۔ بیوی1/8(1) بیٹے7 کل تعداد:8

صورت نمبر7: بیوی اور بیٹیاں (دو یا زائد): اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ اور بیٹیوں کو کل مال وراثت کا دو تہائی حصہ ملے گا جو کچھ باقی بچے گا اگر کوئی دوسرا عصبہ وارث ہو تو اسے مل جائے گا ورنہ باقی رقم بھی لڑکیوں کی طرف لوٹ آئے گی اس کو ردّ کہتے ہیں۔

بیوی1/8(3)، بیٹیاں2/3(16)،کوئی دوسرا عصبہ یا لڑکیاں5،کل تعداد:24

صورت نمبر8: بیوی اور ایک بیٹی: اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ اور بیٹی کو نصف حصہ ملے گا باقی رقم اگر کوئی دوسرا عصبہ ہو تو اسے ورنہ وہ بھی بیٹی کو دے دیا جائے گا۔

بیوی1/8(1) بیٹی1/2(4) کوئی دوسرا عصبہ یا بیٹی3 کل تعداد:8

صورت نمبر9: ماں، باپ، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں ماں اور باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا اور باقی رقم لڑکوں اور لڑکیوں میں حسب ضابطہ تقسیم ہوگی (یعنی لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ملے گا۔) ماں1/6(1) باپ1/6(1) بیٹے اور بیٹیاں4 کل تعداد:6

صورت نمبر10: باپ، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی رقم بیٹیوں اور بیٹوں میں حسب ضابطہ (مذکورہ بالا) تقسیم ہوجائے گی۔

صورت نمبر11: ماں، بیٹے اور بیٹیاں: اس صورت میں تقسیم کا وہی طریقہ ہے جو صورت نمبر10 میں بیان ہوا یعنی کل چھ حصے کر کے ایک حصہ میّت کی ماں کو دیا جائے اور باقی پانچ میّت کی اولاد میں اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دوگنا ملے۔

صورت نمبر12: ماں، باپ، بھائی: اس صورت میں باپ کی وجہ سے بھائی محروم رہے گا۔ ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی مال باپ کو دیا جائے گا کیونکہ باپ اصحابِ فروض میں سے بھی ہے اور عصبہ

بھی، تقسیم درج ذیل نقشہ کے مطابق ہوگی۔ ماں 1/6(1)، باپ 1/6(1)+4=5، کل تعداد:6

نوٹ: باپ کو ایک حصہ بطور فروض اور چار حصے بطور عصبہ ملیں گے۔

صورت نمبر 13: بہن، بھائی: اس صورت میں بہن کو کل مال وراثت کا تہائی اور باقی دو تہائی بھائی کو ملے گا۔ بہنیں 1/3(1) بھائی 2/3(2) کل تعداد:3

صورت نمبر 14: باپ، بیٹیاں: اس صورت میں باپ کو اصحابِ فروض میں سے ہونے کی وجہ سے چھٹا حصہ ملے گا۔ بیٹیوں کو دو تہائی دیا جائے گا اور جو بچے گا وہ بطور عصبہ باپ وصول کرے گا۔ بیٹیاں 2/3(4)، باپ 1/6(1)+2+1، کل تعداد:6

نوٹ: ایک حصہ بچ گیا وہ بھی باپ لے گا گویا بیٹیوں کو دو تہائی اور باپ کو ایک تہائی حصہ مل جائیگا۔

صورت نمبر 15: (دادا اور بیٹے) اس صورت میں دادا چھٹا حصہ وصول کرے گا جیسے باپ کو چھٹا حصہ ملتا ہے اور باقی مال میّت کے بیٹوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ دادا 1/2(1) بیٹے، (5) کل تعداد:6

صورت نمبر 16: (دادا، بیٹیاں) اس صورت میں تقسیم کا وہی طریقہ ہے جو صورت نمبر 14 میں بیان ہوا کیونکہ دادا باپ کے قائم مقام ہے۔

صورت نمبر 17: (باپ، ایک بیٹی) اس صورت میں بیٹی کو نصف مال وراثت ملے گا اور باقی مال میّت کے باپ کے لئے ہوگا۔ بیٹی 1/2(3)، باپ (1+2=3) کل تعداد:6

نوٹ: باپ کو چھٹا حصہ بطور فروض اور باقی بطور عصبہ ملا۔

صورت نمبر 18: خاوند، باپ: اس صورت میں فوت ہونے والی عورت کے خاوند کو نصف مال ملے گا اور باپ چھٹا حصہ بھی لے گا اور جو باقی بچے گا وہ بھی بطور عصبہ وصول کرے گا۔ اس طرح نصف خاوند کو اور نصف باپ کو ملے گا۔ خاوند 1/2(6)، باپ (2+4=6) کل تعداد:12

صورت نمبر 19: بیوائیں اور باپ: اس صورت میں میّت کی بیواؤں کو کل مالِ وراثت کا چوتھا حصہ ملے گا جو ان میں تقسیم ہوگا۔ باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور جو باقی بچے گا وہ بھی بطور عصبہ وہی وصول کرے گا۔ بیوائیں 1/4(3)، باپ (2+7=9) کل تعداد:13

صورت نمبر 20: ماں، باپ، بہنیں: اس صورت میں میّت کی بہنوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ ماں کو چھٹا حصہ اور باقی باپ کو مل جائے گا۔ ماں 1/6(1) باپ 1/6(1)+4 بطور عصبہ

نوٹ: باپ کو چھٹا حصہ فروض کے بطور پر اور باقی رقم بطور عصبہ ملے گی یعنی کل مال سے ایک حصہ ماں کو اور پانچ حصے باپ کو دیے جائیں گے اور بہنیں محروم ہو جائیں گی البتہ وہ ماں کے حصے پر اثر انداز ہوتی ہیں یعنی اگر بہنیں نہ ہوتیں تو ماں کو تہائی اور باپ کو دو تہائی حصہ ملتا۔

نوٹ: جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا یہ چند صورتیں عام طور پر پائی جاتی ہیں اس لئے ان صورتوں میں تقسیم کا طریقہ عرض کر دیا گیا۔ اگر کبھی کوئی دوسری صورت پیدا ہو تو اس کے مطابق علماء کرام سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

حرفِ آخر: آج کے دور میں بعض نام نہاد مسلمان، دشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اسلامی تعلیمات کے خلاف محاذ کھولے ہوئے ہیں۔ کبھی انہیں خلافِ عقل قرار دیتے ہیں تو کبھی (معاذ اللہ) ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان مسائل میں عورت کی دیت، عورت کی گواہی، پردہ اور اس طرح کے چند دوسرے مسائل شامل ہیں۔ وراثت کی تقسیم کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہم اس حکمت کو سمجھ نہ پائیں اس لئے ایمان کا تقاضا ہے کہ قرآن وسنت کے بیان کردہ احکام کو من وعن تسلیم کیا جائے اور ان کی حکمتوں اور مصالح کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سپرد کیا جائے۔

وراثت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کو سامنے رکھیں اور کسی نام نہاد مفکر کے پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہیں زیادہ نفع دے گا (وراثت کے یہ حصے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں۔'' (سورۃ النساء آیت 11)

اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ وہ ذات رحمٰن ورحیم ہم سب کو اسلام کی سنہری تعلیمات کو دل وجان سے قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا

يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا

''جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے''

نجات کی راہ

مقرر: انجینئر مختار فاروقی

مرتب: انجینئر عبداللہ اسماعیل

ہر انسان کے اندر ایک خواہش مضمر ہے کہ کسی طرح اسے دائمی اور ہمیشہ کی زندگی نصیب ہو جائے اسی لیے بعض لوگ زیادہ کمانے، مضبوط مکانوں کی تعمیر اور جسمانی لحاظ سے صحت مند رہنے کے لیے بروقت علاج معالجہ پر کافی توجہ دیتے نظر آتے ہیں۔ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو عارضی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا تو شیطان نے اسی دبی ہوئی خواہش پر اُکساتے ہوئے کہا تھا کہ جس درخت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا ہے وہ ہمیشہ کی زندگی کا راز اور نہ ختم ہونے والی حکومت (کی علامت) ہے۔ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (20-120)۔ اور یہی دبی ہوئی خواہش تھی جس کے تحت ہمارے جدامجد حضرت آدم (اور ہماری اماں حوا) نے اسے کھالیا۔ یہ خواہش آج بھی ہر انسان میں موجود ہے۔ سورۃ العصر میں اس خواہش کا متضاد لفظ 'خسارہ' آیا ہے جس کے معنی کسی نعمت کا انسان کے پاس پہلے موجود ہونا اور پھر چھن جانا ہے۔ یہ زندگی انسان سے چھین لی جائے گی یہ نعمتیں (مال، اولاد، مکان، رشتہ دار وغیرہ) سب چھن جانے والی ہیں۔ اس کا علاج یعنی خسارے سے بچنے اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے لیے قرآن مجید کا بتایا ہوا طریقہ یہ ہے کہ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ تشریح منتخب نصاب میں درج تشریح سے اضافی طور پر ہے اسی نقطہ نظر سے اہل علم اس پر غور فرمائیں۔

جناب انجینئر مختار فاروقی صاحب نے کیڈٹ کالج جھنگ میں 9 جون 2013ء کو ماہانہ درسِ قرآن کے موقع پر یہ خطاب فرمایا تھا، جسے قارئین حکمت بالغہ کے استفادہ کے لیے شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

نجات کا معنی ہے کسی سے چھٹکارا حاصل کرنا یا کسی تکلیف دہ چیز سے، پریشانی والی چیز سے، نقصان سے بچ جانا۔ انگریزی میں اسے SALVATION کہتے ہیں۔ انسان کو اس دنیا میں جو زندگی ملی ہے، آپ بھی زندگی گزار رہے ہیں میں بھی گزار رہا ہوں، اس طرح کچھ بچے ہیں کچھ نوجوان ہیں، کچھ ابتدائی سٹیج پر ہیں کچھ زندگی کے آخری مراحل میں ہیں، ہر شخص کو اپنی زندگی کے بارے میں بہت سارے خدشات لاحق ہیں۔ آدمی بیمار ہو جاتا ہے، کبھی مالی نقصانات ہو جاتے ہیں، ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے یا کسی حادثے میں آدمی اپاہج ہو جاتا ہے، کسی کا والد فوت ہو جاتا ہے، کسی کے عزیز و اقارب فوت ہو جاتے ہیں، کبھی اپنا بیٹا فوت ہو جاتا ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے کہ اس کو پالا تھا بڑا افسر بنانا تھا اور اسے بڑھاپے کا سہارا بننا تھا لیکن بہت ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے، بہت ساری خواہشات مٹی میں مل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اس دنیا میں ایک خواہش ہے کہ اسے دائمی زندگی ملے۔ نوجوان اس کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے لیکن بڑی عمر کے آدمی اس کو تسلیم کریں گے کہ ہر آدمی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ ہمیش زندہ رہوں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ آدمی چاہتا ہے لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَة کہ کاش اس کی عمر ہزار سال ہو۔ جس آدمی کو اس دنیا میں سہولتیں میسر ہوں وہ مرنا نہیں چاہتا، عمر چاہے سو سال سے زیادہ ہو لیکن آسودہ حال ہو، بیمار پڑا ہوا نہ ہو، وہ مرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ بھی ایک دائمی زندگی چاہتا ہے۔ یہ تو انسان کی خواہشات ہیں لیکن اس کے برعکس جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب آدمی پچاس سال کا ہوتا ہے (آج پاکستان میں اوسط عمر پچاس سال ہے) بہت سارا پیسہ کماتا ہے بہت ساری خواہشات رکھتا ہے مکانات بناتا ہے کاروبار چلاتا ہے لیکن بالآخر ایک فرشتہ آتا ہے اور اس کی روح کو لے جاتا ہے۔ رشتہ دار اور تعلق والے سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ آدمی جو چاہتا تھا کہ ہمیشہ زندہ رہوں اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی شاید تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے درمیان کے وقفے کا نام ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم ہے بانگ درا میں 'زندگی'، جس میں انہوں نے کہا ہے: ع جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی۔

اس دنیاوی زندگی کی جو شام ہوتی ہے وہ ایک آنے والی لمبی زندگی کی صبح ہے۔ اس دنیاوی زندگی کی موت آئے گی تو دوسری زندگی کی ابتدا ہو جائے گی۔ زندگی کی اس حقیقت سے جو

بات سامنے آتی ہے اسی کی روشنی میں دراصل ہم نے نجات کی راہ پر بھی غور کرنا ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے لوگ آئے ہیں ہر شخص کے دل میں ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش ہوتی ہے۔ کسی نے تاج محل بنا دیا کہ چلو میں تو نہیں رہوں گا میرے بعد لوگ یاد کریں گے کہ کسی نے تاج محل بنایا تھا۔ کسی نے کوئی اور یادگار بنا دی، کسی نے قطب مینار بنا دیا، کسی نے عراق میں بابل کے معلق باغات بنا دیے، کسی نے اہرامِ مصر بنا دیے۔ آج سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں فرعون نام کے حکمران بادشاہ تھے جن کے پاس بڑے وسائل تھے اور ان میں ہر بادشاہ یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ رہے لیکن یہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ آدمی نے تو مرنا ہی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اہرام مصر بنائے۔ جو بھی بادشاہ آتا تھا وہ فرعون کہلاتا تھا فرعون کسی بادشاہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ان کا لقب تھا، ہر بادشاہ کا نام الگ تھا لیکن کہلاتا فرعون تھا۔ جیسا کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت آئی تھی اس میں بابر، ہمایوں، اکبر یہ سارے حکمران مغل بادشاہ کہلاتے تھے، لیکن نام ان کے الگ ہیں شاہ جہان، اورنگ زیب وغیرہ۔ اسی طرح فراعنہ مصر تھے وہ فرعون کہلاتے تھے یہ ان کا لقب تھا۔ ان میں ایک بڑا بادشاہ تھا جس کا نام خوفو تھا۔ اس نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں ہی بنوالیا تھا اس نے 16 ایکڑ پر رقبے پر ایک ہی عمارت بنائی 900 فٹ لمبی، 900 فٹ چوڑی اور 500 فٹ اونچی ایک عمارت بنائی، ایک سائز کے بڑے بڑے پتھروں والی، جو آج بھی موجود ہے۔ یہ کس بات کی طرف اشارہ تھا؟ اسی میں اس کو دفنایا گیا اور اسی میں اس کا خزانہ رکھ دیا گیا۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ میں نہیں رہوں گا لیکن دنیا کے اندر میری یاد ہمیشہ رہے گی کہ فلاں بادشاہ نے یہ عمارت بنوائی۔ یہ اہرام بتا رہے ہیں کہ ہر انسان کے اندر ایک خواہش ہے، اندر سے ایک 'ہوک' اُٹھتی ہے کہ میں کسی طرح ہمیشہ زندہ رہوں، مجھے دائمی زندگی مل جائے، مجھے موت نہ آئے۔ قرآن مجید میں ہے کہ کافر ایسی عمارتیں بناتے ہیں جیسے انہوں ہمیشہ رہنا ہے۔ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (الشعراء۔129) آج بھی انسان کا یہی حال ہے۔ یہاں بھی یہی حال ہے۔ جھنگ کی کوٹھیاں ہوں یا لاہور کی یا کراچی کی، بحریہ ٹاؤن ہو یا ڈیفنس، ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید بنوانے والا سمجھتا ہے کہ میں نے ہمیشہ ہمیش رہنا ہے۔

نجات کی راہ کیا ہے؟ اب اس پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو خواہش

ڈالی ہے اس کی کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہے۔ ہر انسان کا خواب ہے کہ میں ہمیشہ رہوں تو اس خواب کی کوئی تعبیر بھی ہے۔ اس کی حقیقی تعبیر یہ ہے کہ ایک راہ ایسی ہے جس پر چلنے سے انسان کو دائمی زندگی مل سکتی ہے کہ انسان کبھی نہیں مرے گا، وہ راہ 'نجات کی راہ' ہے اگر انسان اس راستے پر نہ چلے تو نقصان ہی نقصان ہے اور اس صورت میں انسان کی جو دائمی زندگی ہوگی اس میں لَایَمُوْتُ فِیْھَا وَ لَایَحْیٰی کی کیفیت ہوگی۔

نجات کی راہ سے مراد یہ ہے کہ انسان کو جو پریشانیاں اور جو تفکرات ہیں کہ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا، صلاحیتیں چھن جائیں گی، بینائی ختم ہو جائے گی، زندگی مشکل ہو جائے گی کدھر کدھر بھاگیں گے.....ایک وقت میں جسم بھی چھین لیا جائے گا، یہ زندگی ختم ہو جائے گی۔ قرآن بتا رہا ہے کہ ایک نجات کی راہ ہے۔ اگر آپ اللہ کی بات مان لیں، اللہ کے رسول ﷺ کی بات مانیں تو نجات کی راہ موجود ہے۔ اگر آپ اس راستے پر چل پڑیں جو بتایا جا رہا ہے تو پھر آپ کو ایک دائمی اور ہمیشہ ہمیش کی زندگی مل جائے گی۔ اس بات کو ایک دوسرے انداز میں قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ العصر تیسویں پارے میں 103 نمبر سورت ہے اور تین آیات پر مشتمل ہے، قرآن مجید کی مختصر سورتوں میں سے ہے۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ .....''زمانے کی قسم ہے۔ زمانہ گواہ ہے''

آپ دائیں بائیں دیکھیں، آج کے زمانے میں دیکھیں۔ پاکستان میں دیکھیں جاپان میں امریکہ میں غرض ہر جگہ دیکھیں اور ماضی میں سو سال پہلے، ہزار سال پہلے، ہزاروں سال پہلے دیکھ لیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ

''بے شک تمام انسان (HUMANITY AT LARGE) خسارے میں ہیں''

خسارے سے بچنے والے بھی کچھ لوگ ہیں ایک اقلیت ہے تھوڑے سے لوگ ہیں جو اس خسارے سے بچ جاتے ہیں جن کو دائمی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ وہ کون لوگ ہیں؟ جو چار شرطیں پوری کریں یا جو چار کام کریں اُن کو دائمی زندگی مل سکتی ہے۔ پہلی شرط ہے:

اِلَّاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ''جو ایمان لائے'' وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ''اور جنھوں نے اچھے کام کئے''

ایمان کے تقاضے پورے کیے، اس راستے پر جو آگے بڑھانے والی چیزیں ہیں ان کو اختیار کیا۔

وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ''اورانہوں نے آپس میں ایک دوسرے کوحق بات کی تلقین کی''
یعنی دوسروں کو بھی مشورہ دیا کہ آپ بھی ایسے کرلیں تو آپ کی بھی دائمی زندگی سنور جائے گی یا آپ کو یہ کوتاہیاں نہیں کرنی چاہیے ورنہ آپ کی آئندہ زندگی میں مشکلات ہوں گی۔
وَتَوَا صَوْا بِالصَّبْرِ ''اورانہوں نے ایک دوسرے کوصبر کی تلقین کی''
اس راستے میں کچھ مشکلات بھی آئیں گی اور مشکلات آتی ہیں۔ایسانہیں ہوتا کہ ایک آدمی کوئی بات کہہ رہا ہوتو دوسرا لازمی اس کی تصدیق کرے۔ بحث ومباحثہ ہوتا ہے اور کبھی لڑائی جھگڑا بھی ہوجاتا ہے۔اسی لیے قرآن مجید نے کہا ہے کہ وَتَوَا صَوْا بِالصَّبْرِ اگرآپ لوگوں کوراہِ نجات کی تلقین کریں گے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ سب آپ کی بات مان بھی لیں لیکن پھر بھی آپ اپنی بات کہتے رہیں کوئی مانے یا نہ مانے۔ یہ چار شرائط ہیں جوقرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔یہ چار ٹارگٹ حاصل کرلیں تو بس آپ نقصان سے بچ سکتے ہیں اور آپ کی زندگی دائمی خوشگوار زندگی بن سکتی ہے۔
اس آیت کی رو سے خسارے کا لفظ غور طلب ہے۔خسارہ کسے کہتے ہیں؟۔قرآن مجید میں جو الفاظ آئے ہیں کہ زمانہ گواہ ہے کہ اللہ نے سب انسانوں کوایسا بنایا ہے کہ اگر وہ اُس راستے پر چلیں جس سے انہیں دائمی زندگی ملے مگر اکثریت انسانوں کی ایسی ہے کہ اس راستے کے تقاضے پورے نہیں کرتی اور عیاشی بدمعاشی وغیرہ میں لگ کر اپنے فوری فائدے کے لئے اپنا دائمی نقصان کرلیتی ہے۔فرمایا: وَالْعَصْرِ زمانہ اس پر گواہ ہے۔اکثر لوگوں کو دائمی زندگی کی خواہش ہے لیکن اس کے تقاضے پورے نہیں کررہے ہیں اس کے لئے جو قربانی دینی چاہیے اس کے لئے جو ایثار کرنا چاہیے، وقت خرچ کرنا چاہیے، خواہشات پر کنٹرول کرنا چاہیے وہ کام نہیں کرتے ہیں۔خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں ساتھ ہی دائمی زندگی چاہتے ہیں، ایسا نہیں ہوگا۔اس خسارے پر سارا زمانہ گواہ ہے۔اس وقت دنیا کی آبادی 700 کروڑ سے زیادہ ہے، لیکن ان میں سے کتنے لوگ ہیں جو آخرت کے متعلق سوچتے ہیں اور ان شرائط کو پورا کررہے ہیں بہت کم لوگ ہیں شاید ایک فیصد بھی نہیں۔خسارہ عربی لفظ ہے اردو میں بھی بولا جاتا ہے۔کوئی آدمی ہے جس کے پاس کئی لاکھ کا سرمایہ ہے وہ کوئی کام شروع کرتا ہے سال بعد اس کا سارا سرمایہ ختم ہوجاتا ہے اس کے پاس پہلے سرمایہ تھا اب ختم ہوگیا اس کو کہتے ہیں کہ خسارہ ہوگیا۔ایک چیز اس کے پاس تھی وہ کچھ عرصے میں

ختم ہوگئی۔ کسی کے پاس آج صحت ہے مگر وہ ایسے کام کرتا ہے کہ وہ صحت خراب ہو جاتی ہے کسی کے پاس آج عہدہ ہے اور کل وہ عہدہ ختم ہو جاتا ہے کسی کو آج عزت حاصل ہے لیکن وہ کام ایسے کرتا ہے کہ کل اس کی عزت ختم ہو جاتی ہے یہ خسارہ ہے۔ آپ کے پاس کوئی چیز موجود ہے اور آپ اس کے تقاضے پورے نہیں کرتے لہٰذا وہ آپ سے چھن جاتی ہے۔ اسی طرح اُردو میں بیوی کے والد جس کو انگریزی میں FATHER IN LAW کہتے ہیں اس کو سسر یا خسر کہتے ہیں یہ بھی اسی لفظ سے بنا ہے۔ ایک آدمی کے گھر ایک بیٹی ہے 18-20 سال کھلایا پلایا ہے پالا پوسا ہے لیکن وہ اس سے چھن جاتی ہے وہ اسے دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے۔ کوئی چیز اس کے پاس تھی اب وہ نہیں رہی اب وہ اس گھر کا فرد نہیں رہی کبھی کبھار آتی ہے۔ یہ خسارہ کا مفہوم ہے۔ قرآن مجید ایک دوسری جگہ پر کہتا ہے کہ سب سے بڑا خسارہ کیا ہوسکتا ہے؟ یہ دنیا کا خسارہ ہے کہ انسان کے پاس صحت ہے، مال ہے، عزت ہے، عہدہ ہے بہت ساری مثالیں دنیا میں موجود ہیں حکمران ہوتے ہیں اس وقت فرعون بنے ہوتے ہیں پھر دو، چار یا پانچ سال بعد دیکھتے ہیں کہ ہتھکڑیاں پہنی ہیں پولیس کبھی اس عدالت میں کبھی اس عدالت میں لے جا رہی ہے۔ ایک آخرت کا خسارہ ہے۔ انسان کے اندر اس بات کا امکان ہے اللہ نے انسان کے اندر وہ سارا POTENTIAL رکھا ہے کہ اگر انسان نیک کام کرے تو اس کو دائمی زندگی حاصل ہو۔ اچھے کام کرے تو آخرت میں دائمی زندگی مل جائے جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہو۔ لیکن اکثر لوگ ایسی زندگی گزارتے ہیں کہ دنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی خسارہ۔ خَسِرَ الدُّنیَا وَ الْاٰخِرَۃ۔ صرف دنیا کا خسارہ کم نہیں تھا لیکن دنیا میں بھی خسارہ ہو جائے اور آخرت میں بھی کچھ نہ ملے ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْن یہ سب سے بڑا خسارہ ہے اس سے زیادہ انسان کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت اور کوئی نہیں۔

یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ہم میں ہر شخص جو دائمی زندگی چاہتا ہے اس کا جواب اگر ہے تو صرف قرآن مجید میں ہے اس کے علاوہ دنیا کا کوئی فلسفہ، مذہب، سوچ، کسی آدمی کے خیالات انسان کو دائمی زندگی کی گارنٹی نہیں دے سکتے۔ وہ محمد ﷺ ہی ہیں جنھوں نے یہ بتایا ہے کہ ایک اور زندگی آئے گی جو دائمی زندگی ہے۔ اگر کوئی یہاں ایسے کام کر جائے جو اللہ بتا رہا ہے تو دنیا بھی اچھی گزر جائے گی اور موت کے بعد والی زندگی بھی۔ موت ختم ہونے کا نام نہیں ہے، موت تو

ایک دائمی زندگی کے آغاز کا نام ہے۔ جیسے بچے سکولوں میں پڑھتے ہیں پھر کالج میں پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں پھر تعلیمی زندگی ختم کر کے عملی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک طریقہ زندگی سے گزر کر تعلیمی زندگی ختم کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ پہلے آدمی اکیلا ہوتا ہے پھر شادی ہو جاتی ہے یہ زندگی کی مختلف STAGES ہیں۔ اسی طریقے پر اس دنیا کی زندگی سے موت کے بعد انسان دوسری زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ موت ختم ہونے کا نام نہیں اگر موت ختم ہونے کا نام ہو تو پھر اس دنیا کے نتائج ہی اور ہوں۔ بے شمار لوگ جو لوٹ کھسوٹ کر رہے ہیں دوسروں کا حق مار رہے ہیں ناجائز پیسہ جمع کر رہے ہیں۔ قرآن مجید کے نزدیک اس کا نتیجہ نکلنا ہے اور ہر آدمی کا حساب کتاب ہونا ہے اگر موت ختم ہونے کا نام ہو تو جو لوگ اربوں روپے کھا جاتے ہیں فائدے میں ہیں یعنی حرام کھایا، مر گیا اور ختم ہو گیا، کوئی حساب ہی نہیں۔ یہ خواہش تو ہو سکتی ہے کہ ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے ایک اور زندگی مرنے کے بعد آنے والی ہے یہ زندگی عارضی زندگی ہے موت کے ذریعے ہمیں ایک دوسری زندگی میں داخل ہونا ہے اور وہ زندگی دائمی زندگی ہے۔ حضور ﷺ کا ایک خطبہ ہے جس میں آپ نے خوبصورتی کے ساتھ آخرت کی دائمی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

وَ اللّٰہِ اِنَّکُمْ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَ بِالسُّوْءِ سَوءً وَ اِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوِ النَّارُ اَبَدًا (الرحیق المختوم)

''اللہ کی قسم! اے لوگو، تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو۔ پھر یقیناً اُٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو، پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا اور پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔ اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی۔''

موت ختم ہونے کا نام نہیں یہ ایک آرام کا وقت ہے۔ اس کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ یہ ہے آخرت کی زندگی، ہمیشہ ہمیش کی زندگی۔ دائمی زندگی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی اس دنیا میں غلطیاں کرے اور وہاں سزا پائے۔ وہ بھی زندگی ہے لیکن اصل دائمی زندگی ہم اس کو کہیں

گے کہ انسان یہاں اچھے کام کرے وہاں امن وسکون واطمینان کے ساتھ دائمی زندگی گزارے جس میں نہ کوئی پریشانی ہو نہ کوئی دباؤ ہو نہ کسی عزیز کے فوت کی غمی ہو اور نہ کسی اور نقصان کا کوئی خدشہ ہو وہاں آرام ہی آرام اور سکون ہی سکون ہو۔ قرآن مجید ہمیں اس حوالے سے بات سمجھا رہا ہے کہ ہر انسان کی جو دائمی زندگی کی خواہش ہے اس کے لئے اس دنیا میں اپنی یادگاریں چھوڑ کر جاتا ہے، تختیاں لگواتا ہے، پتھر لگواتا ہے، کسی افتتاح پر اپنے نام کی تختیاں لگاتا ہے تاکہ لوگ یاد رکھیں کہ یہ اس نے بنوائی تھی۔ تاج محل اسی طرح بنا ہے، بابل کے باغ اسی طرح تھے، باشاہوں کے محلات اسی طرح ہیں وغیرہ۔ ہر آدمی کے اندر دائمی زندگی کی خواہش ہے اور یہ خواہش آپ کے اندر بھی ہے میرے اندر بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی کو مخاطب کر رہا ہے اسی کو زیر بحث لا رہا ہے کہ جناب یہ خواہش ہے تو یہ نہیں ہے کہ اس کو ایک طرف ہی رکھ دیا جائے۔ اس خواہش کا ایک حصہ آپ کو مل سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لیے قربانی دیں۔ آخرت کی دائمی زندگی آپ کو بھی میسر آ سکتی ہے بشرطیکہ آپ یہ چار کام کر لیں جو قرآن مجید کہتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ جنت میں جو خوش نصیب لوگ جائیں وہ خالدین فیھا ابدا وہ ہمیشہ ہمیش جنت میں رہیں گے۔

قرآن مجید کی یہ سورۃ العصر ہمیں نجات کی راہ اور خسارے سے بچاؤ کا راستہ بتا رہی ہے اور سادہ الفاظ میں خسارے سے بچاؤ یہ ہے کہ میاں تم کیا سوچ رہے ہو تمہارے پاس جو چیز بھی ہے وہ تم سے چھن جانی ہے آج تمہارے پاس صحت ہے چھن جائے گی، آنکھیں ہیں چھن جائیں گی جسم ہے ختم ہو جائے گا، حتیٰ کہ تمہاری یہ جو دنیا کی زندگی ہے تمہیں موت آئے گی تمہارے رشتہ دار تمہیں قبر میں دفنا آئیں گے۔ ایک ہی شکل ہے کہ اگر تم آخرت پر ایمان لا کر اس کے مطابق کچھ کام کر لو تو تمہیں مثبت دائمی زندگی مل سکتی ہے جہاں پر نہ کمانے کی فکر ہوگی، نہ انسانی مصیبتیں مثلاً بیماری، پریشانی، تھکاوٹ۔ ان ساری پریشانیوں سے اس زندگی میں مستقل طور پر نجات مل جائے گی۔ وہاں سے متعلق قرآن مجید اور احادیث میں وضاحت آئی ہے کہ انسان وہاں ایک خاص عمر میں داخل کیا جائے گا۔ حدیث کے مطابق 30-35 سال کی عمر میں انسان (چاہے جوانی میں فوت ہوا ہو چاہے بوڑھا ہو کر) اس میں داخل کیا جائے گا عمر نہیں بڑھے گی، ناخن نہیں بڑھیں گے، بال نہیں بڑھیں گے، بیماری نہیں ہوگی، پریشانی نہیں ہوگی، یہ وہ دائمی زندگی

ہے جس کا اس دنیا میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ دنیا میں کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک بحریہ ٹاؤن یا کسی اور سوسائٹی میں ایک بہت بڑا بنگلہ بنالیا ہے یا خرید لیا ہے بہت اچھی جگہ ہے چاروں طرف باغ ہیں اس میں ہرن ہیں پرندے ہیں جانور ہیں اور بہت سی خاص جگہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ کہ اس دنیا میں آپ جتنا بڑا گھر بنالیں اور کتنے ہی اچھے ماحول میں بنالیں کبھی بجلی چلی جائے گی کبھی پنکھا خراب ہو جائے گا۔ اس طرح کی اور پریشانیاں ہوتی ہیں۔ دنیا میں جتنا بڑا گھر بنایا جاتا ہے اس کا اتنا ہی زیادہ خرچہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ دنیا میں گھر بنا لیتے ہیں مگر وہ دائمی نہیں ہوتا، مشاہدہ میں آیا ہے کہ کتنے لوگ ہمارے سامنے ریٹائر ہوتے ہیں پہلے آرزو کرتے ہیں کہ ریٹائر ہوں گے تو گھر بنانا ہے (کیونکہ ساری عمر کرائے کے مکان میں گزاری ہوتی ہے) ریٹائر ہوتے ہی مکان بنایا مگر ابھی پورے طریقے سے شفٹ نہیں ہوتے کہ ملک الموت آجاتا ہے۔

اس دائمی زندگی کو حقیقتاً حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ العصر میں چار شرائط بیان کی ہیں۔ یہ چاروں شرائط لازمی ہیں تب ہمیں وہ دائمی زندگی مل سکتی ہے اور ہم خسارے سے بچ سکتے ہیں اور اگر چاروں شرائط پوری نہ ہوں گی تو کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ مزید یہ کہ یہاں کم سے کم کا ذکر ہے، اونچے درجوں کا ذکر نہیں۔ اگر یہ ہو کہ یہ چار کام کرنے سے اعلیٰ درجے کی زندگی ملے گی تو پھر آدمی سوچ سکتا ہے کہ چلو 1st ڈویژن نہ سہی 2nd سہی، 3rd سہی، پاس تو ہو جائیں گے۔ انداز یہ نہیں ہے۔ انداز یہ ہے کہ کم از کم پاس مارکس جو ہو سکتے ہیں اگر تم چار کام کرلو تو پھر فیل ہونے سے بچ جاؤ گے۔ وہ سزا والی دائمی زندگی سے بچ جاؤ گے۔ لہٰذا یہ چاروں شرطیں پوری کرنا لازمی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

1۔ پہلی شرط ہے ایمان۔ الحمد للہ ہم مسلمان ہیں اور کئی اصطلاحات اور الفاظ کی طرح ہمارے گھروں میں ایمان کا لفظ بولا جاتا اور بچے بھی اگر کسی کا حق مارا جائے، باری نہ ملے تو کہتے ہیں کہ بے ایمانی ہوگئی۔ ایمان کا مطلب ہم سمجھتے ہیں مگر اس کے تقاضے پر بھی غور کرنا ہوگا۔ ایمان کا لفظ امن سے بنا ہے اور جس کو ایمان حاصل تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کو سکون کی کیفیت حاصل ہو۔ ایمان کا ایک حصہ اقرار باللسان کہلاتا ہے دوسرا تصدیق بالقلب ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان زبان سے گواہی دے اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمد عبدہ و رسولہ ۔ یہ اقرار

باللسان ہے۔ جو آدمی یہ کہے وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ اسے صاحب ایمان کہتے ہیں لیکن کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی غلطی کر کے کہیں پکڑا جاتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کام کیوں کیا؟ تو دل میں اور بات ہوتی ہے مگر آدمی زبان سے اور بات کہہ رہا ہوتا ہے۔ بچہ سکول سے گھر لیٹ پہنچے اور اس سے پوچھا جائے تو وہ دل میں حقیقت جاننے کے باوجود زبان سے اور بات کرے گا کہ صحیح بات کرنے سے پٹائی ہوگی۔ گھر سے سکول دیر سے جائے تو بھی یہی معاملہ ہوتا ہے کہ بچہ جھوٹ بولتا ہے یہ عام مثالیں ہیں کہ دل میں اور بات ہو اور زبان پر اور بات ہو۔ اس بات کی تصحیح ہونی چاہئے۔ اس کو قرآن کہتا ہے کہ اور معاملات میں تو اصلاح ہوتی رہے گی مگر ایمان کے بارے میں انسان زبان سے اقرار کرے اور دل میں یقین نہ ہو تو بات نہیں چلے گی۔ اس لئے کہا گیا کہ پہلا حصہ زبان سے اقرار ہے اور دوسرا یہ ہے کہ زبان کی کہی ہوئی بات دل میں بھی ہو۔ اور دل اور زبان کی کیفیت ایک ہی ہو یہ ایمان حقیقی ہے۔ اگر ایسا ایمان پیدا ہو جائے تو قرآن اس ایمان کی بہت شان بیان کرتا ہے۔ اچھے انداز سے تذکرہ کرتا ہے گویا انسان دائمی زندگی کے راستے پر چل پڑا ہے۔

2۔ دوسری شرط ہے عمل صالح۔ یہ بات ایمان کا حصہ ہے کہ ہم اللہ کو، محمد رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہیں قرآن اور فرشتوں کو مانتے ہیں۔ آخرت کی زندگی کو مانتے ہیں یہ دنیاوی زندگی مکمل نہیں ہے کہ اچھوں کا اچھا نتیجہ اور بروں کا برا نتیجہ نہیں نکلتا۔ مرنے کے بعد اور زندگی ہے جو نبیوں نے بتائی ہے۔ کوئی فلسفی یا سائنسدان نہیں بتا سکتا۔ صرف نبیوں نے یہ بات بتائی ہے۔ یہ ایمان ہے یہ پہلا نشان ہے اگر آپ صحیح راستے پر ہیں تو یہ نشان آتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ جھنگ سے ٹوبہ جا رہے ہیں۔ 10 کلومیٹر کے بعد قصبہ باغ آتا ہے۔ آپ گاڑی پر سفر شروع کریں اور پندرہ بیس منٹ تک قصبہ باغ نہ آئے تو آپ سمجھ جاتے ہیں کہ غلط سڑک پر آ گئے ہیں۔ اگر آپ سیدھے راستے پر ہیں تو یہ منزل آنی چاہئے۔ اگر نجات کی راہ پر چل پڑے ہیں، ایمان آپ نے پا لیا اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ہے تو اگلی منزل نظر آنی چاہئے اور وہ منزل ہے عمل صالح۔ جیسے ٹوبہ جاتے ہوئے باغ آنا چاہئے اسی طرح ایمان صحیح ہے تو انسان کا عمل بھی بدلنا چاہئے اس کی سوچ، باتیں، گفتگو، اٹھنا بیٹھنا، سونا، جاگنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہونا چاہئے۔ البتہ اس میں غلطی کوتاہی ہو جانا الگ بات ہے۔ اگر کسی شخص نے دائمی زندگی حاصل کرنے کا فیصلہ نہیں

کیا تو وہ رات کو جب چاہے سوئے، صبح جب چاہے اٹھے۔ لیکن اگر اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں آخرت کی زندگی چاہتا ہوں اور ایمان بھی حاصل کر لیا ہے اور عمل صالح پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سونے جاگنے کے اوقات بدلنے ہوں گے، زندگی بدلنی ہوگی۔ ورنہ ایمان صرف زبان تک محدود ہے۔ یہ تبدیلی دراصل عمل صالح ہے۔ مزید یہ کہ انسان کے اندر خواہشات ہیں۔ ان کو قابو کرنا عمل صالح ہے۔ اور یہ فیصلہ کون کرے گا کہ عمل صالح کس کس چیز کا نام ہے؟ آخرت کے بارے میں آنحضور ﷺ نے بتایا ہے اور دائمی زندگی اللہ نے دینی ہے۔ لہٰذا اس راستے کے تقاضے بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ بتائیں گے۔ عمل صالح وہی ہوں گے جو اللہ نے بتائے ہیں جو آنحضور ﷺ نے واضح کر دیے ہیں۔ امریکہ کا ایک نوجوان جو اللہ کو نہیں مانتا یا جو عیسائی ہے اس کے اور مسلمان کے ٹائم ٹیبل میں فرق ہوگا۔ مسلمان اور ہندو کے ٹائم ٹیبل میں فرق ہوگا لائف سٹائل، سونے، جاگنے میں فرق ہوگا۔ ہم مسلمان دائمی زندگی کی بات کرتے ہیں وہ دائمی زندگی کو مانتا ہی نہیں ہے۔ تو اس کا طرزِ عمل اور ہوگا ہم مسلمانوں کا طرزِ عمل اور ہونا چاہیے، ترجیحات کا فرق ہوگا۔

عمل صالح ہر اس عمل کا نام ہے جو اللہ نے ہمارے لئے معین کر دیے ہیں۔ سادہ الفاظ میں ہر وہ کام جو حضرت محمد ﷺ نے اختیار کیا ہے اور ہمیں بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کی ہے۔ آپ ﷺ نے بعض کام ایسے کیے ہیں جو خصوصی طور پر صرف آپ ﷺ کے لئے تھے، ان کو چھوڑ کر باقی سب کام جو آپ ﷺ نے بتائے ہیں اور حکم دیا ہے وہ سارے کام کرنے ہوں گے اور یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ دین کے سارے کام ایک ہی وقت میں کرنے کے نہیں ہیں۔ ایک کام آج ہے۔ ابھی آدمی کھانا کھا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اذان ہوگی نماز پڑھنی ہوگی پھر جہاد کا حکم دیا جائے گا تو جہاد کے لئے نکلنا ہوگا۔ کاروبار میں جائے گا تو اس کے معاملات ہوں گے۔ ایک نوجوان کے تقاضے اور ہیں جب اس کی شادی ہوگی اس کے تقاضے اور ہوں گے۔ ابھی کوئی آدمی اکیلا ہے پھر اس کے بچے ہوں گے پھر اس کے بچے جوان ہوں گے اس وقت کے تقاضے اور ہیں۔ سارے احکامات پر ایک ہی وقت میں عمل نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی میں جذبہ ہونا چاہئے کہ جو آج تقاضے ہیں وہ آج ہی پورے کر رہا ہوں جو 20 سال بعد کے تقاضے ہوں گے وہ تب پورا کروں گا جو 30 سال کے بعد کے تقاضے ہوں گے وہ تب پورا کروں گا۔ تو ہر شخص کو ارادہ کرنا چاہئے کہ مجھے بہر حال دین پر چلنا

ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے دائرے کے اندر اندر زندگی گزارنی ہے۔

3۔ تیسری شرط ہے تواصی بالحق۔ اگر اسے بھی عمل صالح کا حصہ سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عمل صالح یعنی تواصی بالحق بھی کرو۔ اور اگر الگ سمجھا جائے تو مطلب ہوگا کہ عمل صالح بھی کرو اور تواصی بالحق بھی کرو۔ نماز روزہ بھی کرو اور دین کو دوسروں تک بھی پہنچاؤ۔ اللہ کے دین کو اللہ کی مخلوق تک پہنچانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ آج محمد ﷺ کے بعد 1400 سال گزر چکے ہیں لیکن اگر آج ہم اللہ کا نام لیتے ہیں قرآن پڑھتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو یہ چیزیں ہمیں کس نے پہنچائی ہیں براہ راست آپ ﷺ سے ہم نے نہیں سنی بلکہ آپ ﷺ نے کچھ لوگوں تک یہ پیغام پہنچایا اور عمل کر کے بتایا۔ انہوں نے اس کو سمجھا اور آگے پہنچایا پھر انہوں نے آگے پہنچایا پھر انہوں نے آگے پہنچایا۔ اسی طرح کسی نے ہم تک یہ دین پہنچا دیا ہے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے آگے پہنچائیں۔ بڑی کوتاہی ہوگی کہ ہم تک تو یہ پیغام پہنچ جائے، ہم کامیابی کے راستے پر چل پڑیں، مگر اگلی نسل کو نہ پہنچائیں۔ اگلی نسل ہمیں بُرا کہے کہ خود عمل کر لیا مگر ہم تک نہ پہنچایا۔ تو یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم حق بات کرتے رہیں، کہتے رہیں، لوگوں کے کانوں میں ڈالتے رہیں کوئی سنے یا نہ سنے، کوئی مانے یا نہ مانے، کوئی بات نہیں، ہمارا کام پیغام پہنچانا ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں رسول کو انگریزی میں MESSANGER کہتے ہیں اور رسالت کو MESSAGE۔ محمد ﷺ پیغامبر ہیں۔ اس کے معنی بھی پیغام لانے والے کے ہیں۔ آپ ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے جو پیغام آیا تھا اس کو لوگوں تک پہنچانا آپ ﷺ کا فرض منصبی تھا۔ اسی طرح یہ پیغام آج ہمارے پاس ہے اگر ہم اس کو جوں کا توں آگے پہنچائیں (یہ نہیں کہ آدھا چھپالیں) تو یہ تواصی بالحق ہے۔ جیسا صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سیکھا اور آگے پہنچایا۔

4۔ چوتھی شرط ہے تواصی بالصبر۔ اگر تم دائمی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ راستہ اپناؤ۔ مگر عمل صالح اور تواصی بالحق کا راستہ مشکل راستہ ہے۔ اپنے بھائی کو بتانا، برادری کو بتانا، حکمرانوں کو بتانا مشکل ہے؛ اسی لیے فرمایا اس راستے میں مشکلات آئیں گی۔ کبھی ایسا ہوگا کہ آپ بات کہیں گے تو لوگ WELCOME کریں گے لیکن کبھی کبھی ایسا ہوگا کہ لوگ نہیں سنیں گے۔ کبھی کبھی ایسا ہوگا آپ کو ناپسند کریں گے۔ آپ ﷺ کے ساتھ یہ سارے معاملات پیش آئے ہیں آپ ﷺ

سے بہتر کوئی معلم نہیں ہوسکتا، آپ ﷺ نے بہت اعلیٰ سطح پر کام کیا جیسا کرنے کا حق تھا مگر مخالفتیں ہوئیں۔ ہمارا راستہ بھی روکا جاسکتا ہے رکاوٹیں آسکتی ہیں، نہ آئیں تو کوئی بات نہیں مگر اصولی بات یہ ہے کہ اس کام میں مشکلات آتی ہیں۔ قرآن مجید کے دوسرے پارے میں ارشاد ہے، جس میں ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ غلط فہمی میں نہ رہنا کہ ہم ہجرت کر کے اللہ پر احسان کر کے آئے ہیں بلکہ عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ فرمایا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ﴾ جانیں جائیں گی توقعات ختم ہوں گی اور مشکلات آئیں گی اور اس آیت سے پہلے فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ O﴾ ''جو اللہ کے راستے میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہے مگر تم جان نہیں سکتے۔'' یہاں کوئی موت ہو جائے تیسرے دن ساتویں دن اکٹھ ہوتا ہے اور لوگ چیزیں پیش کرتے ہیں کہ متوفی کو یہ چیزیں پسند تھیں پتا نہیں وہاں مل رہی ہیں کہ نہیں۔ اللہ کہہ رہا ہے کہ اگر وہ نیک آدمی ہے تو وہ ایسی دائمی زندگی میں ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن اس کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا صبر کرنا ہوگا۔ بات آسان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں توفیق دے کہ ہم ایک دائمی زندگی حاصل کرنے کا فیصلہ کریں۔ اس کے ضمن میں ایمان درکار ہے، عمل صالح درکار ہے، قربانی درکار ہے۔ ہر آدمی کے ایمان کا جو درجہ ہے اس سے اسی طرح کا عمل صالح درکار ہے۔ مثلاً دیہاتی آدمی جو شہر نہ آتا ہو پھر بھی دائمی زندگی کی خواہش اس کا حق ہے۔ اس سے تھوڑا ایمان اور تھوڑا عمل درکار ہے اس سے تواصی بالحق اور بالصبر بھی تھوڑا درکار ہوگا۔ دوسری طرف ملک کا وزیراعظم یا صدر یا کوئی با حیثیت شخص ہوسکتا ہے اس کا ایمان بہت اعلیٰ ہونا چاہیے اور عمل صالح بھی اتنا ہی بلند ہونا چاہئے۔ ایمان بڑا ہے تو عمل صالح بھی بڑا اور تواصی بالحق بھی بڑا اور صبر بھی بڑا درکار ہے۔ اور چاروں چیزیں ضروری ہیں لازمی ہیں شاعری میں ایسا ہوتا ہے شعر میں کئی الفاظ صرف وزن پورا کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اچھے شاعروں کے شعروں میں فضول اور زائد الفاظ کم ہوتے ہیں۔ غالب کو اس بات پر مان تھا کہ جو لفظ میرے شعر میں آئے اسے عام نہ سمجھو۔ لیکن قرآن مجید جو اللہ کا کلام ہے اس کا ہر لفظ 101 فی صد ضروری تھا تو اللہ نے استعمال کیا۔ لہٰذا اللہ نے اگر آخرت کی کامیابی کی چار شرائط بتائی ہیں تو وہ پونے چار نہیں ہوسکتی۔ چار ہی ضروری ہیں دو نہیں ہوسکتیں۔ آج ہمارا مزاج یہ

ہے کہ ہم عام مسلمان تواصی بالحق اور تواصی بالصبر تو دور کی بات ہے نماز روزہ بھی نہیں کرتے صرف ایمان بلکہ صرف زبانی کلمہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ نجات حاصل ہوگئی۔ ہم آدھی شرط کو لے کر بیٹھے ہیں۔ کوتاہی تو ہوسکتی مگر انسان چار شرطوں کو آدھا کردے تو یہ ذاتی فیصلہ ہے اللہ کہ طرف سے گارنٹی نہیں ہے۔ اسی کو مثال سے سمجھئے۔ ڈاکٹر کا نسخہ سامنے رکھئے اصل دوا ایک ہوتی ہے باقی دوائی اس کے SIDE-EFFECT ختم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اگر کوئی انسان زیادہ عقل مند بنے اور کہے کہ میں صرف ایک گولی استعمال کروں گا تو کیا شفا ہوجائے گی۔ اسی طرح حکیموں کے نسخے ہیں۔ ایک چیز 10 گرام ہو اور دوسری 500 گرام اور آپ تو گھر آکر 10 گرام والی کو 500 گرام اور 500 گرام والی کو 10 گرام کردیں تو وہ نسخہ شفا نہیں ہو بلکہ وہ نسخہ ہلاکت ہوگا۔ اسی طرح جو شرائط اللہ کی بتائی ہوئی ہیں اگر انسان ان میں کمی کردے۔ عمل صالح صفر کردے، دوسرے کام بہت اونچے بھی ہوں تب بھی خسارے سے بچاؤ نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ کہ یہ سورۃ العصر ہے جس میں اللہ نے ہمیں ایسے راستے کی نشان دہی کی ہے کہ جس سے انسان کی ایک دبی ہوئی خواہش کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کی سہولیات والی زندگی حاصل کرلوں، پوری ہوسکتی ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہزار میں سے ایک آدمی بھی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتا اور آخرت میں ایک غریب سے غریب آدمی بھی اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اس کو دائمی زندگی مل جائے گی۔ اللہ نے اس کے لیے چار شرائط بتائی ہیں۔

وَالْعَصْرِ O اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O اِلَّاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ O زمانہ گواہ ہے کہ بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں۔ ان سے ہر چیز چھن جانے والی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اس کے شایان شان عمل کیے اور اسی کی پرچار اور تبلیغ کی اور اس راستے کی مشکلات پر صبر کیا۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ مجھے بھی اور آپ کو بھی ان باتوں کی سمجھ اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور وہ دائمی زندگی جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں جنت میں ہمیں عطا فرمادے۔ آمین۔

اہرامِ مصر کے بارے میں انگریزی زبان کا ایک قطعہ

Calm & resolute, the pyramids equal into eternity, they define the cry of man's will to survive and conquer the strolls of time.

اسلام اور سائنس

سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

'اسلام اور سائنس' کو ہم یہاں اقبال اکادمی لاہور کی اجازت سے قسط وار شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

خلافِ قرآن عقیدہ

پھر اگر کوئی فلسفی یا سائنسدان ایسا ہو جو اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود مغربی عیسائی سائنسدانوں کی تقلید میں خدا کے عقیدہ کو فلسفہ اور سائنس سے بے تعلق یا فلسفہ اور سائنس کے منافی خیال کرتا ہو تو کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس نے قرآن کی تعلیمات کے خلاف ایک نیا عقیدہ بنا لیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا تصور تمام سچائیوں کو روشن کرنے والی سچی حقیقت نہیں اور وہ اسلام کے خدا کو اس طرح نہیں مانتا جس طرح سے اسلام اس سے توقع رکھتا ہے۔ ورنہ خود فلسفہ اور سائنس ہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خدا کے عقیدہ کو فلسفہ اور سائنس کی راہ نما حقیقت کے طور پر کام میں لاتا اور اس کی روشنی میں فلسفہ اور سائنس کی صداقتوں کی کامیاب جستجو کرتا۔

محکومی کا سحر

اگر عہد قدیم کے ان مسلمانوں کو جو سائنس کے بانی تھے یہ کہا جاتا کہ سائنس کو خدا کے عقیدہ سے اور خدا کے عقیدہ کو سائنس سے الگ کر دو تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آسکتی اور وہ کہنے والے کو دیوانہ یا احمق سمجھتے۔ پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ اگر آج کسی مسلمان سائنسدان کو کہا جائے کہ خدا کا عقیدہ سائنس کی لازمی بنیاد ہے جس کے بغیر وہ من کل الوجوہ اور مجموعی طور

پر ترقی نہیں کرسکتی تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ اُلٹی ذہنیت عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید سے پیدا ہوئی ہے اور یہ کورانہ تقلید مغرب کی محکومیت اور مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ محکومی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ قوموں کا ضمیر بدل دیتی ہے۔ جو چیز ان کو محکومی سے پہلے اچھی نظر آتی تھی، محکومی کے بعد رفتہ رفتہ بری نظر آنے لگتی ہے اور جو چیز محکومی سے پہلے بری نظر آتی تھی وہ محکومی کے بعد رفتہ رفتہ اچھی نظر آنے لگتی ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اشتراکیوں کے نزدیک مادّہ اپنی نام نہاد جدلی صفات کے سمیت ایک ایسی ہی یقینی حقیقت ہے جیسی کہ ایک سچے مسلمان کے نزدیک خدا اور اس کی صفاتِ رحمت و ربوبیت۔ لہٰذا انہوں نے مادّہ اور اس کی مزعومہ جدلی صفات کو اپنی سائنس کا راہ نما تصور بنایا ہے یہاں تک کہ اُن کی سائنس اس تصوّر کے دائرہ سے ایک اِنچ باہر نہیں جاسکتی۔ اگر اشتراکی اپنے جھوٹے خدا کے عقیدہ پر سائنس کی بنیاد رکھ سکتا ہے تو مسلمان کو کیا مجبوری ہے کہ وہ اپنے سچے خدا کے عقیدہ پر سائنس کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ آج کافر کو اپنے جھوٹے خدا پر جس قدر یقین ہے مسلمان کو اپنے سچے خدا پر نہیں۔

پانچواں مغالطہ اس میں یہ ہے کہ خدا کا عقیدہ سائنسدان کے لئے علت اور معلول کے پورے سلسلہ کو دریافت کرنے میں سہولت کی بجائے رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ خدا کے عقیدہ میں یہ بات ہرگز شامل نہیں کہ خدا اپنی تخلیق کے لئے ظاہری اور خارجی اسباب وعلل کے ایک سلسلہ سے کام نہیں لیتا بلکہ اس عقیدہ میں یہ بات ایک ضروری عنصر کے طور پر شامل ہے کہ خدا مسبّب الاسباب اور علت العلل اور حقیقت الحقائق ہے اور اس کی تخلیق ظاہری اور خارجی اسباب وعلل کے ایک سلسلہ کی صورت اختیار کرتی ہے جو ہمارے مشاہدہ اور مطالعہ میں آسکتا ہے۔ اس سلسلہ کی دریافت ہمارے مشاہدہ اور مطالعہ قدرت پر موقوف ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کرنا خود خدا کے عقیدہ کی رُو سے ہمارے لئے کس قدر ضروری ہے اور یہ کہ مشاہدہ اور مطالعہ سے درست نتائج اخذ کرنے کے لئے بھی خدا کا عقیدہ

کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ مظاہر قدرت میں سلسلۂ اسباب وعلل کی ہر کڑی یعنی ہر علت اور ہر سبب بذاتِ خود ایک مظہر صفات باری تعالیٰ اور ایک آیت اللہ ہے اور ایک مردمؤمن کے مشاہدہ اور مطالعہ کا ایسا ہی حقدار ہے جیسے کہ اور مظاہر قدرت، کیونکہ وہ بھی اپنی نوعیت یا ماہیت خدا کی صفات کے عمل سے اخذ کرتا ہے اور خدا کی صفات کا آئینہ دار ہے۔ خدا کے عقیدہ کی وجہ سے سائنسدان کی تحقیق پر صرف یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ ہر علت اور سبب کے اندر خدا کی صفات کا جلوہ دیکھتا ہے اور لہٰذا اس کو پوری طرح سے سمجھتا ہے۔ حضور ﷺ کی اس دعا کے مطابق جو اُوپر نقل کی گئی ہے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اشیاء کو اس طرح دیکھے جس طرح کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اگر اسباب وعلل کا سلسلہ جیسا کہ وہ فی الواقع ہے کسی خاص مقام پر نہیں رُکتا تو وہ سائنسدان جو سچا مسلمان ہے اپنی سائنسی تحقیق کو خدا کے عقیدہ کی وجہ سے اسے وہاں روکنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ اسے آگے لے جائے گا اور اس کی انتہا تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور یقین کے معاملہ میں کافر مسلمان پر سبقت لے گیا ہے۔

؎ کافر بیدار دل پیش صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

غلطی سے رجوع کرنا، حالت انحطاط سے نجات کا واحد راستہ ہے

اگر ہم اپنی موجودہ یاس انگیز حالتِ انحطاط سے نجات پانا چاہتے ہیں تو اس کا طریق سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہماری جو بڑی غلطی اس کا سبب بنی ہے اس پر اِصرار کرنا ترک کردیں اور اس سے رجوع کریں۔ عیسائی مغرب کی تقلید میں سائنس کو خدا سے اور خدا کو سائنس سے الگ نہ کریں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق مظاہر قدرت کا مطالعہ آیاتُ اللہ کے طور پر کریں تمام سائنسی علوم یعنی مادّی، حیاتیاتی اور نفسیاتی اور انسانی علوم کو مقدس اور اسلامی علوم سمجھیں؛ کیونکہ وہ ہمارے خدا کی پیدا کی ہوئی مقدس کائنات کے اور آیات اللہ کے تشریحی علوم ہیں اور اپنے ان آبائے اوّلین کی روایات کو زندہ کرتے ہوئے جو دنیا کے سب سے پہلے سائنسدان تھے خدا کے عقیدہ کو پھر اسی طرح سائنس کی اساس بنادیں جس طرح وہ پہلے تھا۔

سائنسی علوم کی ماڈل اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت

اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے سائنسی علوم کی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی بنائیں جس کی طرز پر بعد میں اور یونیورسٹیاں بنائی جاسکیں۔ اس یونیورسٹی کے لئے ایم ،ایس ،سی تک تمام سائنسی علوم کی نصابی کتابوں کو قرآن کے فلسفۂ علم کی روشنی میں نئے سرے سے اس طرح لکھیں کہ خدا کی خالقیّت اور ربوبیتِ عالم کا عقیدہ ہر سائنسی علم کا مرکز اور مدار اور محور بن جائے اور طالب علم کو یہ محسوس ہونے لگے کہ وہ اس علم کا مطالعہ نہیں کر رہا بلکہ خدا کی صفاتِ خالقیت اور ربوبیت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جیسا کہ ان کا ظہور کائنات کے اس طبقہ یا حصہ میں ہوا ہے جس کا علم اس کو بہم پہنچایا جا رہا ہے۔

سائنسی علوم کی تشکیل جدید کے بنیادی اُصول

اوّل: سائنسی علوم کی تشکیل جدید کے دوران میں سب سے پہلی بات جو ہمیں مدنظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ صحیح تصورِ حقیقت کو سائنسی علوم کے اندر سمونے سے تمام غلط سائنسی علوم تبدیل ہوکر درست ہوتے ہیں اور تبدیلی نہ صرف ان علوم کے نقطۂ نظر اور ان کی غرض و غایت میں ہوتی ہے بلکہ ان کا متن یا مواد بھی بدل جاتا ہے۔ لیکن ان کے متن اور مواد کے اندر جو تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ طبعیاتی علوم میں بہت کم، حیاتیاتی علوم میں اس سے زیادہ اور نفسیاتی یا انسانی علوم میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے مواد کے اندر تبدیلی کی وسعت اسی نسبت سے زیادہ ہوتی جاتی ہے جس نسبت سے کائنات کا وہ طبقہ جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں شعوری مقصدی فعلیّت کے وصف سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظریۂ کائنات، مقصد کائنات کا ایک نظریہ بھی ہوتا ہے اور وہ کائنات کے تینوں طبقوں میں سے کسی طبقہ کے علم کے اندر اتنا ہی داخل ہوسکتا ہے جتنا کہ خود اس طبقہ کے اندر کائنات کا مقصد شعوری طور پر آزاد یا آشکار ہو۔ مادّہ مقصدی فعلیّت سے بالکل محروم ہے؛ لہٰذا نظریہ کی نوعیت مادّی یا طبعیاتی علوم پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے۔ حیوان غیر شعوری مقصدی فعلیت سے بہرہ ور ہے لہٰذا نظریہ کی نوعیت حیاتیاتی علوم پر مادّی علوم کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے لیکن انسان خود شعور ہے اور آزادانہ شعوری مقصدی فعلیت کی استعداد رکھتا ہے۔ لہٰذا

نظریہ کی نوعیت نفسیاتی یا انسانی علوم پر حیاتیاتی علوم سے بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک نئے نظریہ کی روشنی میں یہ سائنسی علوم یکسر بدل جاتے ہیں۔ اور یہ سائنسی علوم وہ ہیں جو انسان کی عملی زندگی کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے غلط ہونے سے انسان کی ساری عملی زندگی غلط ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دوسرے سائنسی علوم کا بھی صحیح استعمال نہیں کر سکتا اور ان کے درست ہونے سے اس کی ساری عملی زندگی درست ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے سائنسی علوم سے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحیح تصورِ کائنات کے مطابق سائنسی علوم کا تعمیر کرنا یا بدلنا انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک یا دوسرے نظریہ کو ریاضیات یا طبعیات ایسے مستیقن (EXACT) علوم کے اندر داخل کرنے سے ان علوم کے اندر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی لیکن یہاں میں شہرۂ آفاق حکیم شپنگ لر (SPENGLER) کی کتاب ''زوالِ مغرب'' "THE DECLINE OF THE WEST" کا ایک حوالہ درج کرتا ہوں جس سے پتہ چل جائے گا کہ اس سلسلہ میں غیر جانبدارانہ محققین کی رائے کیا ہے:

> ''ہر علمی حقیقت خواہ وہ کیسی ہی سادہ ہو آغاز ہی سے اپنے دامن میں ایک نظریہ کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ چیز جسے ہم ایک حقیقت کہتے ہیں ایک نادر الوقوع اثر ہے جو ایک بیدار شخصیت پر پڑتا ہے اور تمام باتوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا وہ شخصیت جس پر یہ اثر پڑ رہا ہے یا پڑ رہا تھا کلاسیکی ہے یا مغربی، گاتھکی ہے یا بیرونی'' (ص:۳۷۹)
>
> ''ہر مستیقن (EXACT) چیز بذاتِ خود بے معنیٰ ہوتی ہے۔ ہر طبعیاتی مشاہدہ اس طرح سے تشکیل پاتا ہے کہ وہ بعض سابقہ خیالی مفروضات کی بنیاد کو ثابت کرتا ہے اور اس کے کامیاب اتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سابقہ مفروضات اور زیادہ قابل یقین ہو جاتے ہیں۔ ان مفروضات کے بغیر نتیجہ محض خالی خولی اعداد تک منحصر ہو کر رہ جاتا ہے لیکن درحقیقت ان مفروضات سے نہ تو ہم الگ ہوتے ہیں اور نہ ہی ہو سکتے ہیں اگر کوئی محقق کوشش کر کے اپنے تمام مفروضات کو جنھیں وہ جانتا ہے طے کر کے ایک

طرف رکھ دے تو خواہ وہ یہ سمجھے کہ اب اس کا کام بالکل صاف اور واضح ہو گیا ہے تاہم جونہی وہ اپنی تحقیق کا آغاز کرے گا مفروضات پر اس کا یہ تصرف نہ رہے گا کہ وہ ان کو الگ رکھ سکے بلکہ وہ خود ان مفروضات کے غیر شعوری تصرف میں چلا جائے گا کیونکہ تحقیق بہر حال ایک زندہ عمل ہے اور ہر زندہ عمل میں ایک انسان اپنی ثقافت، اپنے عصر، اپنے مدرسہ اور اپنی روایات کے تابع ہونے پر مجبور ہے۔ ایمان اور علم دراصل باطنی ایقان ہی کے دو پہلو ہیں مگر ان دونوں میں ایمان کو تقدم حاصل ہے اور علم کے تمام اعتبارات پر خواہ وہ کیسے ہی غیر واضح ہوں، اس کی بالادستی کا سکہ رواں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ نظریات ہیں نہ کہ محض اعداد جو کہ تمام طبعی علوم کی بنیاد بنتے ہیں۔ ثقافتی انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر اس اصلی سائنس کی لاشعوری طلب کروٹیں لیتی رہتی ہے جو اس کی اپنی ثقافت کی روح کے مطابق ہو اور یہ طلب قدرت کے کسی عالمگیر تصور کو سمجھنے اور اس پر حاوی ہونے اور اس کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے کارفرما ہوتی ہے۔ دشوار اور محنت طلب پیمائشیں، جو محض پیمائشوں کی خاطر کی جائیں، چھوٹے ذہنوں کے لئے باعث اطمینان ہونے کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہر تصور جو کسی حالت میں بھی دائرۂ اِمکان میں داخل ہوتا ہے اپنے موجد کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ مقولہ کہ ''خدا نے انسان کو اپنے نمونہ پر بنایا ہے'' ہر تاریخی مذہب پر صادق آتا ہے لیکن ہر طبعیائی علم کے لئے بھی کچھ کم صحیح نہیں خواہ اس علم کی نام نہاد واقعاتی یا تجرباتی اساس کتنی ہی محکم کیوں نہ ہو'' (ص:۳۸۱)

''عالم کی عقلی تشکیل کی اس صورت کو (یعنی علم طبعیات کو) ایسی ہی دوسری صورتوں پر اوّلیت دینے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ ہر تنقیدی علم، ہر مذہبی یا غیر مذہبی عقیدہ کی طرح باطنی ایقان پر ہی قائم ہوتا ہے۔ اگرچہ ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے اس باطنی ایقان کے مظاہر لاتعداد ہوتے ہیں تاہم وہ اپنے بنیادی اُصول کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔ لہٰذا طبعی علوم کا مذہب کو ہدفِ ملامت بنانا ''بومرانگ'' ایسے ہتھیار کی طرح ہے جو پھینکنے والے

ہی کی سمت میں لوٹ آتا ہے۔

ہر تہذیب خیالات و اعمال کا اپنا منفرد اور ذاتی ہیولیٰ خود تیار کرتی ہے جو اس کے اپنے لئے امر حق ہوتا ہے اور اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک کہ وہ تہذیب خود زندہ رہتی ہے اور اپنے امکانات کو آشکار کرتی رہتی ہے۔ جب کوئی تہذیب اپنے خاتمہ کے قریب پہنچتی ہے اور اس کے تخلیقی قوے فنا ہو جاتے ہیں یعنی اس کی قوت تخیل اور فکر و زباں کی قوتیں مردہ ہو جاتی ہیں تو صرف بے روح ضابطے اور مردہ نظام ہائے فکر کے ڈھانچے باقی رہ جاتے ہیں جن کو دوسری تہذیب سے وابستہ افراد لفظاً تو پڑھ لیتے ہیں مگر ان کو تہی از معنی محسوس کرتے ہیں یا غیر اہم گردانتے ہیں۔ پھر یا تو وہ ان کو میکانکی انداز میں محفوظ کر لیتے ہیں یا حقیر جان کر فراموش کر دیتے ہیں۔ اعداد، ضوابط اور قوانین کا کچھ مطلب نہیں اور وہ کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا کوئی جسد ہو اور صرف ایک ایسی زندہ جماعت ہی جو اپنی زندگی کو ان کے وجود کے اندر اور ان کے وجود کی معرفت وسعت دیتی ہو اور ان کے ذریعہ سے اپنا اظہار کرتی ہو اور اندر ہی اندر ان کو اپناتی ہو اور ان کو اس کی نعمت سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی مطلق علم طبعیات کا وجود نہیں ہوتا بلکہ الگ الگ علوم طبعیات کا وجود ہوتا ہے۔ جو اپنی مخصوص تہذیبوں کے گہواروں میں پروان چڑھتے اور مٹ جاتے ہیں۔'' (ص:۳۸۲)

''حسی وقوف میں صرف طول و عرض ہی موجود ہوتا ہے اور یہ تعبیر کا زندہ اور ضروری عمل ہی ہے (اور یاد رہے کہ ہر زندہ چیز کی طرح یہ عمل اپنے اندر سمت، حرکت اور رجعت ناپذیری کے وہ تمام اوصاف رکھتا ہے جن کو ہمارا شعور ''وقت'' کی اصطلاح میں جمع کر دیتا ہے) جو ان کے اندر گہرائی پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان کے تار و پود سے حقیقت اور نوعیت عالم کی تشکیل کرتا ہے۔ زندگی ہمارے تجربات میں، ایک تیسرے بعد کی حیثیت سے داخل ہوتی ہے'' (اوسولڈ اشپنگلر: ''زوال مغرب'' جلد اوّل، باب 11 انگریزی اشاعت، 1944ء) (جاری ہے)

قرآنِ مجید میں وارد
'سب سے بڑے ظالم شخص'
کے منفی کردار کی جھلکیاں
(جو آج بھی معاشرے میں کھلی آنکھ سے دیکھی جاسکتی ہیں)

انجینئر مختار فاروقی

01. قرآنِ مجید دنیا کی ایک منفرد اور 'نادر' کتاب ہے۔اس کتاب کے لانے والے حضرت محمد ﷺ ہیں جو نبی آخرالزماں اور سیدالاوّلین والآخرین ہیں۔حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے یہ کتاب آپ ﷺ پر اُتری اور یہ 'کلام' ہے خالق ارض وسماء ربّ کائنات 'اللہ تعالیٰ' کا۔اس کتاب کی خصوصی شان یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر ختم نبوّت کی وجہ سے اب یہ کتاب انسانیت کی طرف اللہ کا آخری پیغام ہے اور یوں یہ اس مقام کی مستحق بھی تھی اور یقیناً ایسا ہی ہے کہ یہ کتاب اب قیامت تک 'محفوظ' و 'مامون' کتاب ہے اور دشمنوں کی سازشوں، شرارتوں، منصوبوں، چالوں اور کارستانیوں کے باوجود صفحۂ ہستی پر موجود رہے گی چاہے ـــــــ خدا بیزار، دین دشمن، انسان دشمن اور اخلاق دشمن گروہ کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

02. قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے اور پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔لہٰذا اس کتاب کی اپنی اصطلاحات اور موضوعات ہیں۔ یہ کتاب اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی طرف سے ہے لہٰذا اسی کتاب میں کائنات کی صحیح ترین تعبیر بیان ہوئی ہے اور حقیقت انسان کا بھی 'صحیح ترین' بیان آیا ہے کہ انسان کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ نفسیاتِ انسانی اپنی جزئیات سمیت جتنی اس کتاب میں درج ہیں وہ شاید دنیا بھر کا لٹریچر جمع کر دیں تب بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

03. اس کتاب کے مطابق اس کائنات میں پہلی حقیقت 'اللہ' ہے جس نے اس محسوس اور

نظر آنے والی کائنات کو پیدا کیا ہے۔ دوسری بڑی حقیقت انسان ہے کہ وہ صرف حیوان نہیں بلکہ اپنے اندر ایک روحانی وجود بھی رکھتا ہے:

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
اقبالؔ غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

اس انسان کے اندر نیکی بدی کا احساس ہے آخرت یعنی اس دنیا کے نامکمّل ہونے اور ایک اور دنیا جس میں انسان کو دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب ہو، جزا و سزا (جنّت و دوزخ) کے فیصلے ہوں، ودیعت شدہ ہے۔ یہ آخرت کا اقرار ہے اور تیسری حقیقت انسانوں کی رہنمائی کے لئے 'وحی' اور انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ہے، جس کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آخری وحی قرآنِ مجید ہے ان حقائق کا ادراک و اعلان اس کتاب کے ایک حقیقی انسان سے ناگزیر تقاضا ہے۔

04. قرآن پاک میں پھر اچھے انسانوں اور دوسرے انسان کے کردار کے نقشے دیے گئے ہیں تا کہ ہر انسان اپنے کردار کا جائزہ لے سکے کہ وہ آج کی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے اچھے پسندیدہ بندوں میں کھڑا ہے یا بُرے لوگوں میں شامل ہے۔

بُرے لوگوں میں خدا بیزار، وحی دشمن اور انسان دشمن لوگ ہیں جنہیں قرآن کافر کہتا ہے کفر کی شکلوں میں 'شرک' کی کئی شکلیں ہیں۔ وحی دشمن کردار کی ایک پہچان ـــــــ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن پاک کے بارے میں کسی من گھڑت بات کا اعلان ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی فرضی (FABRICATED) باتوں کا دعویٰ ہے۔ یہ قرآن کی اصطلاح میں تکذیب کہلاتی ہے اور یہ 'کفر' سے بھی بڑا جرم ہے۔ اسی میں پیغمبروں علیہم السلام کی کردار کشی، حوصلہ شکنی، ایک خوف کا ماحول پیدا کیے رکھنا، اہل ایمان کو DEMORALISE کرنا، بے عزتی، مار پیٹ، تشدّد، سوشل بائیکاٹ وغیرہ کے حربے ہیں۔ تا کہ دنیا میں حق نہ پھیل سکے اور دنیا انسان دوست اور اخلاق دوست، علم دوست، حیوان دوست اور ماحول دوست رویّوں سے خالی ہو جائے اور ظلم، تعدی، بے حیائی، حیوانیت، لوٹ کھسوٹ، جھوٹ فراڈ، بے روزگاری اور شراب سے بھر جائے۔ جو لوگ دنیا میں اچھی اقدار کو ختم کر کے ظالمانہ اور استحصالی اقدار کا فروغ چاہتے ہیں ایسے لوگ قرآن مجید کی اصطلاح میں ایک عالمی برائی کی قوت شیطان کے ساتھی ہیں، 'حزب الشیطان' ہیں

اور یہ گروہ ہر وقت انسان دوست، علم دوست ماحول کے فروغ کے لئے کوشاں اہل ایمان طبقے سے حالت جنگ میں رہتے ہیں اس دوسرے طبقے کو قرآن مجید 'حزب اللہ' کہتا ہے۔

05. حزب الشیطان میں شامل لوگوں میں سب سے بُرے کردار کے لوگوں کے لئے قرآن مجید 'سب سے بڑا ظالم شخص' کی اصطلاح بار بار استعمال کرتا ہے اور ایسے کردار ہر دور میں رہے ہیں ہر معاشرے میں ہوتے ہیں اور بڑے بااثر، باوسائل، مقتدر طبقات کے دوست اور پروپیگنڈا کے ماہر ہوتے ہیں۔

اس مضمون میں اس 'سب سے بڑے ظالم شخص' کے کردار کے بارے میں قرآن مجید میں وارد شدہ آیات کو یکجا کر کے اس انسان دشمن گروہ کا ایک خاکہ سامنے رکھا گیا ہے تاکہ ہر شخص اس گروہ کے کردار، اس کے کارکنان اور سرپرستوں کو پہچان کر اپنے لئے صحیح راستہ منتخب کر سکے اور ہو سکے تو دیگر اپنے جیسے انسانوں کو اس انسان دشمن گروہ سے متنبّہ کر کے ان کو بھی اس شیطانی گروہ کے جال سے بچا سکے اور دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے والے اس شیطانی ایجنڈے کے بارے میں حقیقت حال آنکھوں کے سامنے آ سکے۔

06. قرآن مجید میں 'مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ .....' کی ترکیب 15 مرتبہ آئی ہے اور ایک خاص ابلیسی اور وحی دشمن کردار کا بڑا واضح ہیولیٰ قاری کی آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔

آیئے، ان آیات سے ماخوذ اس کردار کے چند اوصاف پیش خدمت ہیں۔

(ا) سورۃ العنکبوت (29-68) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا جو خالق کائنات کی ذاتِ اقدس پر جھوٹ بول دے یعنی اس کی کسی صحیح اور معقول بات کو غلط قرار دے یا کسی نامعقول اور عقل وفطرت کے خلاف بات کو اس کی طرف منسوب کر دے۔ مزید برآں جب اس کے سامنے حقیقت کھل کر سامنے آ جائے (حق) تو اس کی تکذیب کر دے۔

(ب) سورۃ الانعام (06-21) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا جو 'من گھڑت' بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے اور/یا اس کی آیات کی تکذیب کر دے۔

(ج) سورۃ الانعام (06-93) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا جو 'من گھڑت'

بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردے اور/یا یہ دعویٰ کرے کہ میری طرف وحی آتی ہے حالانکہ اس کی طرف کوئی وحی نہیں آئی (اہل مکہ حضرت محمد ﷺ کی طرف سے قرآن مجید کے پیش کرنے پر یہ کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ حضرت محمد ﷺ خود بنا کر پیش کرتے ہیں اور منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے ہیں یہ آیت تعریض کے انداز میں ان کے تبصرے کی بے ہودگی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی خاموشی چہ معنی دارد؟ یعنی اللہ تعالیٰ کا حضرت محمد ﷺ پر ناراض نہ ہونا، وحی کا سلسلہ جاری رہنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ ﷺ کا دعویٰ انزالِ وحی برحق ہے)۔

(د) سورۃ الانعام (06-144) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا جو اپنے دل سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دے تاکہ لوگوں کو حق سے باز رکھے اور ان کو گمراہ کر سکے۔

(ہ) سورۃ الانعام (06-157) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا جس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آیات (قرآن مجید) پیش کیا جائے اور وہ اس کی تکذیب کر دے اور بات کو صحیح سمجھتے ہوئے بھی اس کو قبول کرنے سے پہلوتہی کرے۔

(و) سورۃ الاعراف (07-37) میں ہے کہ اس سے بڑا بے انصاف شخص (کردار کے اعتبار سے) کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف من گھڑت باتیں منسوب کرے اور اس (سبحانہٗ وتعالیٰ) کی نازل کردہ آیات جو حضرت محمد ﷺ اہل مکہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان کو 'جھوٹ' قرار دے۔ (نعوذ باللہ)

(ز) سورۂ یونس (10-17) میں ہے کہ اس شخص سے بڑا بے انصاف شخص کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف من گھڑت باتیں بلا دلیل اور خلاف حقیقت منسوب کرے اور اس کے برعکس جب حضرت محمد ﷺ ان کے سامنے اللہ تعالیٰ (جس کو اہل مکہ بھی مانتے تھے) کی طرف سے نازل کردہ آیات (قرآن مجید) پیش فرمائیں تو اس کو 'جھوٹ' قرار دے دے۔ (نعوذ باللہ)

(ح) بارہویں پارہ میں سورۂ ہود (11-18) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص (رؤسائے مکہ میں سے حضرت محمد ﷺ کے مخالفین کے مقابلے میں) کون ہوگا یعنی یہ خود سب سے بڑے

بے انصاف (پرلے درجے کے ظالم) ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف بے بنیاد من گھڑت باتیں منسوب کر دیتے ہیں (ایک دن روزِ قیامت ہوگا اس دن) یہ سب لوگ اپنے اس فعل قبیح کے ارتکاب کے جرم میں اس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (اہل ایمان بھی اس دن پیش ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ سے انعامات حاصل کریں گے) جبکہ معاندین اسلام جو آج مغرور اور سرکش ہیں وہ اس دن پیش ہو کر آج کے رویّوں کی غلط وضاحتیں کریں گے جو قبول نہیں ہوں گی اور سزا پائیں گے۔

(ط) سورۃ الکہف (18-15) میں ہے کہ مشرکین مکّہ شرک کرتے ہیں اور اس عمل پر مُصر ہیں جبکہ اصحابِ کہف نے تو بادشاہ کے سامنے پیش ہو کر اپنی قوم کے شرک پر علیٰ رؤس الاشہاد تنقید کرتے ہوئے اُن سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس 'شرک کرنے کے 'عمل قبیح' پر کوئی دلیل کیوں نہیں لاتے اور بلا دلیل یہ خلافِ عقل وفطرت کام کرتے آرہے ہیں۔ سب سے بڑا ظالم شخص وہی ہے جو غلط اور من گھڑت بات کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کر دے۔

(ی) سورۃ الکہف (18-57) میں وارد ہے کہ اس سے بڑا ناانصاف کون ہوگا جس کو اپنے رب کے کلام اور آیاتِ الٰہی کے ذریعے نصیحت کی گئی مگر اس نے اس سے (حقیقت سمجھتے ہوئے بھی) انکار کر دیا۔

(ک) سورۃ السجدہ (32-22) میں وارد ہے کہ اس سے بڑا ڈھیٹ اور بے انصاف شخص کون ہوگا جس کے سامنے حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آیات پیش فرما رہے ہیں اور وہ ان آیات کو اپنے دل میں حق جان کر بھی ان سے اعراض اور پہلو تہی کی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔

(ل) چوبیسویں پارے کے آغاز میں سورۃ الزمر (39-32) میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم شخص کون ہوگا یعنی وہی شخص سب سے بڑا ظالم اور بے انصاف ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بول دے (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی بات منسوب کر دے) اور جب سچائی اس کے سامنے پیش ہو تو اس کو جھوٹ قرار دے دے۔

(م) سورۃ البقرہ (02-114) میں وارد ہے کہ مکے والے حضرت محمد ﷺ اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو مکّے سے نکلنے پر مجبور کر کے ان کو 'بیت اللہ' سے روکنے کے جرم کا ارتکاب کرنے

جارہے ہیں ایسا کرنے والے سب سے بڑے ناانصاف اور ظالم لوگ ہیں جو بیت اللہ میں آنے سے اُن لوگوں کو روکتے ہیں جو وہاں آ کر اس گھر کے مالک 'اللہ' کا نام لیتے ہیں (جبکہ اہل مکہ بیت اللہ میں آ کر بھی اپنے خودتراشیدہ 360 بتوں کی پرستش کرتے تھے اور اللہ کا نام بہت تھوڑا لیتے تھے)۔

(۶) سورۃ البقرۃ (02-140) میں ہے کہ بنی اسرائیل یعنی اہل کتاب جو مدینے میں آباد ہیں وہ حضرت محمد ﷺ کی آمد کے سلسلے میں ہی یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اب حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے ہیں تو ان کو پہچاننے کے باوجود وہ ان کا نہ صرف خود انکار کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی روک رہے ہیں اور ان کے خلاف منصوبے بنا رہے ہیں یعنی وہ 'حق' جو ان کے پاس 'اپنی کتابوں' میں موجود ہے اس کو چھپانے کے مرتکب ہو رہے ہیں یہی سب سے بڑی ناانصافی ہے اور ایسا شخص سے سب سے بڑا بے انصاف وحی دشمن اور خدا بیزار شخص ہے۔

(۷) سورۃ الصّف (61-07) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ کے بعد ذکر ہے کہ اہل مکّہ جن کو حضرت محمد ﷺ نے خود اسلام کی دعوت دی مگر وہ اس پر ایمان لانے کی بجائے اُلٹا حضرت محمد ﷺ پر الزامات لگانے لگ گئے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ اور بے حقیقت باتیں منسوب کرنے لگے۔ فرمایا یہ لوگ سب سے بڑے ظالم ہیں۔

07. اُوپر درج 15 حوالہ جات میں تکرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بول دینا یا 'تکذیب' کا ذکر ہوا ہے۔ ہم آگے بڑھنے سے پہلے یہاں لفظ 'کفر' کے مقابلے میں 'تکذیب' کی وضاحت ضروری سمجھتے ہوئے درج کر رہے ہیں تاکہ قارئین کے ذہن میں تکذیب کا مفہوم واضح رہے اور خلط مبحث نہ ہونے پائے اور قرآن پاک کی اس بنیادی اصطلاح 'تکذیب' کی وضاحت بھی ہو جائے۔ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے والے مبتدی حضرات کو ان شاء اللہ اس سے فائدہ ہوگا۔

08. 'کفر' اور 'تکذیب' کا فرق

قرآن پاک میں 'کفر' اور تکذیب کے الفاظ اہل دوزخ اور کفّار کے لئے ہیں جب دو لفظ ہیں تو یقیناً 'کفر' اور تکذیب کا مفہوم بھی مختلف ہوگا۔ اس لئے کہ کسی زبان کے دو الفاظ ہو بہو ہم معنی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً سورۃ التغابن میں ہے:

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا وَ

بِئۡسَ الۡمَصِيۡرُO (10-64)

''اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی اہل دوزخ ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے اور وہ بری جگہ ہے۔''

اسی طرح کا مضمون سورۃ الحدید (19-57) میں بھی آیا ہے۔

کُفر: عربی میں کفر کا لفظ اوّلاً شکر کے مقابلے میں آتا ہے جس کے معنی ناشکری یا اُردو محاورے میں کفرانِ نعمت ہے۔ سورۃ ابراہیم کی مشہور آیت ہے:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَ لَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌO (07-14)

''اور جب تمہارے پروردگار نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو (یادرکھو کہ) میرا عذاب (بھی) سخت ہے''۔

کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں یا ڈھاپنے کے اسی لئے یہ لفظ عربی میں کسان کے لئے آتا ہے جو بیج کو زمین میں چھپاتا ہے جس سے وہ اُگتے ہیں اور فصل ہوتی ہے یہ مفہوم سورۃ الحدید (20-57) میں آیا ہے۔ یہیں سے دین میں کسی غلطی یا کوتاہی کے لئے کفّارہ کا تصور ہے جس کے معنی اس غلطی کو ڈھانپ لینے کے ہیں، قسم کا کفّارہ، روزہ میں غلطی سے کھانے پینے کا کفّارہ وغیرہ۔

اصطلاحاً کفر کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دل میں اسلام کی حقانیت کی بات کو چھپا کر زبان سے اس کا انکار کردینا ہے۔ کفر کا لفظ ایمانِ حقیقی کے 'متضاد' مفہوم کے لئے بھی قرآن پاک میں آیا ہے۔ (39-24)

تکذیب: کِذب خود جھوٹ بولنا یا خلافِ حقیقت کسی بات کا اظہار کرنا یا کسی واقعہ کو اس طرح بیان کرنا کہ مخالف صحیح سمجھ رہا ہو جبکہ فی الحقیقت وہ اس طرح کا نہ ہو۔ جبکہ باب تفعیل میں كَذَّبَ يُكَذِّبُ تَكۡذِيۡبًا کے معنی کسی دوسرے آدمی کو بات کرنے پر بلا دلیل جھوٹا کہنا اگرچہ وہ سچ ہی بول رہا ہو۔

کفر اور تکذیب کی مثال:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکّی دور میں مختلف مواقع پر وعظ فرماتے دعوتِ اسلام دیتے، مختلف

محافل میں، صحن کعبہ میں، میلوں کے اجتماعات میں، حج کے دوران قیام منیٰ وغیرہ میں لوگ آپ کی بات سنتے اس وعظ یا بیان یا تقریر پر لوگوں کی طرف سے مختلف ردّعمل ہوتے تھے۔

اوّلاً : وعظ سن کر بغیر کسی تأثر ظاہر کیے محفل سے چلے گئے بات دل میں رکھی بعد میں کسی موقع پر اس پر سوچا یا نہیں سوچا۔

ثانیًا : بات سن کر دل نے گواہی دی مگر اس کا اظہار نہ کیا اور نہ اسلام لانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔

ثالثًا : دل نے گواہی دی اور انسان نے آگے بڑھ کر آپ ﷺ کے سامنے اس کے حق ہونے کا اظہار کیا اور اسلام قبول کر کے کلمہ پڑھ لیا اور اس کا اعلان کر دیا۔

رابعًا : دل نے گواہی دی۔ دل میں ارادہ کیا کہ اظہارِ حق کر دیا جائے مگر کسی غیر مرئی خوف و لالچ سے قبولِ حق سے رُک گیا اور دل کی گواہی کو دل میں ہی دفنا دیا ـــــــ اُوپر درج لغوی بحث کے مطابق یہ عمل اصطلاحاً 'کفر' ہے اور ایسا شخص کافر ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہی یہی ہے کہ حق کا احساس اور حق کی پہچان انسان کی فطرت اور ضمیر انسانی میں ہے انسان کا ضمیر اُسے صحیح مشورہ دیتا ہے مگر انسان اپنے ضمیر کی بات کو دبا دیتا ہے اور بات کو قبول نہیں کرتا۔ دراصل کفر یہی ہے دل نے گواہی دی مگر زبان سے انکار کر دیا۔ یہ کفر ہے اور ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

خامسًا : کسی شخص نے 'کفر' کا ارتکاب کیا مگر اپنے مفادات اور مرتبہ و مراعات کے پیش نظر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دوسروں کو اس دعوتِ حق کے قبول کرنے سے روکنے کے لئے کھڑے ہو کر کسی بات پر اعتراض کر دیا یا اعلان کر دیا کہ یہ سب 'جھوٹ' ہے یا بولنے والے کو کہہ دیا کہ آپ 'جھوٹ' بول رہے ہیں۔ یہ عمل تکذیب ہے۔ 'کفر' کے مقابلے میں تکذیب کا عمل کئی گناہ بڑا گناہ ہے اس لئے قرآن پاک میں کفر کے مقابلے میں تکذیب کے عمل پر زیادہ وعیدیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب و ناراضی کا ذکر آیا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک عام آدمی کی گفتگو اور حضرات انبیاء کرام کی گفتگو میں مقام و مرتبہ اور کردار کا بڑا فرق ہے۔ ایک عام انسان کی تقریر یا وعظ پر کسی کا معترض ہونا یا کسی واقعی بات یا غلط فہمی کی بنیاد پر جھوٹ کا لفظ بول دینا اور بات کہنے والے کو جھوٹا کہہ دینا سامع کا اخلاقی

حق ہے اور رہے گا۔ مگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام چونکہ اعلیٰ کردار کے مالک ہوتے تھے اور ان سے اظہار و دعویٰ نبوت سے پہلے بھی کسی شخص کو جھوٹ، وعدہ خلافی، خلافِ حقیقت بات یا کردار کی کسی خامی کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس ثابت شدہ حقیقت کی موجودگی میں کسی سامع کا ان کو 'جھوٹا' کہنا یا ان کی کسی بات کو من گھڑت کہنا خود کہنے والے کے کردار کے گھٹیا ہونے کی دلیل بن جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر پیغمبر کے مخالفین اور بالخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاندین ان کے دور میں بھی کسی اخلاقی کمزوری اور کردار کی خامی کو لے کر کھڑے نہیں ہوئے بلکہ کردار کشی کے جتنے ہتھکنڈے استعمال کیے وہ سب بے بنیاد اور بلا دلیل ثابت ہوئے اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اعلیٰ کردار کی بنیاد پر اپنے معاشرے میں سرخرو اور سرفراز ہوئے۔

اس وجہ سے اس اعلیٰ کردار کے حامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنا، قرآن مجید میں خود کہنے والے کے داخلی نفسیاتی ہیجان، منقسم شخصیت اور اغراض کا بندہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت بن جاتا ہے اور پرلے درجے میں قابل مذمّت ہے۔

عمل تکذیب کے خوفناک نتائج

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کی تکذیب ایک انفرادی فعل بھی ہوسکتا تھا/یا ہوتا تھا اور اجتماعی شکل میں کسی گروہ کی طرف سے ایک سوچے سمجھے طے شدہ منصوبے کے تحت بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کے عواقب و نتائج میں مقدار کا فرق رہے گا نوعیّت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن پاک میں تکذیب آیات یا تکذیب انبیاء کرام علیہم السلام کے قبیح عمل کے مختلف منطقی نتائج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(ا) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن اُترتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ابلاغ اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ذرائع استعمال فرماتے تھے مثلاً کبھی آپ اپنے قریب موجود مسلمانوں کو ہی سناتے تھے اور وہ جا کر خصوصی طور پر بھی اور غیر ارادی طور پر بھی کافروں کی محافل اور ڈیروں پر سناتے تھے جس سے کلامِ الٰہی ان تک پہنچ جاتا تھا۔ کبھی آپ کعبہ میں موجود قریبی لوگوں کے سامنے اُسے بیان فرماتے تھے۔ اسی طرح کے ایک واقعہ کا تذکرہ سورۂ مدثر میں ہے اور ایک سردارِ مکّہ کے انکار کا بڑا مؤثر نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًاO وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا O وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًاO وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًاO ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ O کَلَّا اِنَّهٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا O سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا O اِنَّهٗ فَکَّرَ وَ قَدَّرَ O فَقُتِلَ کَیْفَ قَدَّرَO ثُمَّ قُتِلَ کَیْفَ قَدَّرَ O ثُمَّ نَظَرَ O ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَO ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَکْبَرَO فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْر یُّؤْثَرُ O اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ O

''ہمیں اس شخص سے سمجھ لینے دو جس کو ہم نے منفرد پیدا کیا اور اس کو بہت سارا مال دیا اور (ہر وقت پاس) حاضر رہنے والے بیٹے (دیے) اور ہر طرح کے سامان میں خوب وسعت دی ابھی خواہش رکھتا ہے کہ اور دوں، ہرگز نہیں! یہ ہماری آیتوں کا دشمن ہو گیا اب اسے ایک چڑھائی پر چڑھاؤں گا اس نے غور کیا اور ذہن بنایا اور مارا جائے اس نے کیسا ذہن بنایا پھر یہ مارا جائے اس نے کیسا ذہن بنایا۔ پھر رُکا پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا پھر پشت پھیر کر چلا گیا اور (قبولِ حق سے) تکبر کیا پھر کہا: یہ تو جادو ہے جو (اگلوں سے) منتقل ہوتا آ رہا ہے (اللہ کا کلام نہیں بلکہ) یہ کسی بشر کا کلام ہے'' (74-11 تا 25)

—— کبھی مسلمانوں سے کافر راہ گزرتے یا ملاقات پر کسی نئی آیت یا وحی کا از راہ مزاح یا سنجیدگی سے استفسار کرتے تھے جس پر اہل ایمان اُن کا تازہ 'وحی' سنا دیتے تھے۔

قرآن مجید میں حکم ہے کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے (بلند آواز سے) تو خاموش رہو اور غور سے سنو (07-204) صاف ظاہر ہے کہ اس حکم پر اہل ایمان ہی عمل کرتے تھے جبکہ کافر اس موقع پر جبکہ انہیں قرآن سنایا جا رہا ہے شور مچاتے تھے اور HOOTING کرتے تھے تاکہ کوئی اسے نہ سن سکے اور نہ سمجھ سکے اور یوں لوگ قرآن مجید کے 'سحر' میں نہ آسکیں۔ اس کا ذکر سورۂ حم السجدہ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَO

''اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو اور (جب پڑھنے لگیں تو) شور مچا دیا کرو تاکہ تم غالب رہو'' (41-26)

(ب) کچھ مسلمان جب اہل مکہ کے ساتھ کسی تقریب میں جمع ہوتے تھے تو کافر بالارادہ ایسے موقعوں پر مسلمانوں کو ستانے اور دل شکستگی کے لئے اسلام اور قرآن کے خلاف باتیں اور بحث شروع کر دیتے تھے۔ ایسے مواقع کبھی آپ ﷺ کی موجودگی میں بھی پیش آجاتے تھے۔ اس سے عام مسلمانوں پر اس بحث کا اثر بھی ہوتا تھا۔ اگر مسلمان خاموش رہیں تو لوگ اس اسلام دشمن پراپیگنڈا سے مرعوب ہوتے تھے اور جواب دیں تو بات اُلجھنے اور تو تکار تک جانے کی نوبت آجاتی تھی۔ ایسے مواقع کا تذکرہ قرآن پاک میں سورۃ الانعام میں آیا ہے:

وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖ ؕ وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ O وَمَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّلٰکِنۡ ذِکۡرٰی لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ O (06--68-69)

''اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بے ہودہ بکواس کررہے ہیں تو ان سے الگ ہوجاؤ یہاں تک کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہوجائیں اور اگر (یہ بات) شیطان تمہیں بُھلا دے تو یاد آنے پر ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو اور پرہیزگاروں پر ان لوگوں کے حساب کی کچھ بھی جواب دہی نہیں۔ ہاں نصیحت تاکہ وہ بھی پرہیزگار ہوں''

ان آیات میں کفّار کے جس منفی رویہ اور وحی بیزار اور خدا بیزار سوچ کا تذکرہ ہے اسی کا پرتو چند برس بعد مدینہ منوّرہ میں یہود اور اُن کے زیر اثر منافقین مدینہ کی محافل میں بھی سامنے آیا تھا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکۡفَرُ بِہَا وَ یُسۡتَہۡزَاُ بِہَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖۤ اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَالۡکٰفِرِیۡنَ فِیۡ جَہَنَّمَ جَمِیۡعَا (04-140)

''اور اللہ نے تم (مومنوں) پر اپنی کتاب میں (یہ حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم (کہیں) سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہورہا ہے اور ان کی ہنسی اُڑائی جاتی ہے تو

جب تک وہ لوگ اور باتیں (نہ) کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہیں جیسے ہو جاؤ گے۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکٹھا کرنے والا ہے۔''

گویا کفّار ہر طریقہ پر عام مسلمانوں کو اسلام، وحی اور قرآن مجید کے علاوہ حضرت محمد ﷺ سے برگشتہ کرنے اور تفریق پیدا کرنے کے درپے رہتے تھے جو اسی عمل تکذیب کا نتیجہ تھا۔

(ج) کفار مکہ اپنی نجی محافل میں مشورہ کر کے آپ ﷺ پر الزام تراشی کرتے تھے اور مختلف فقرے چست کرتے تھے۔ سورۂ ص میں ارشاد ہے:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَاءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ O اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ O وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ O مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ O ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا

''اور انہوں نے تعجّب کیا کہ ان کے پاس ان ہی میں سے ہدایت کرنے والا آیا اور کافر کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا۔ کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا؟ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ تو ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو اور اپنے معبودوں (کی پوجا) پر قائم رہو۔ بے شک یہ ایسی بات ہے جس سے (تم پر شرف وفضیلت) مقصود ہے۔ یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اُتری ہے؟'' (38-4 تا 7)

اس پر مزید قرآن مجید نے اُن کے اس منفی رویہ پر یوں تبصرہ کیا ہے:

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ O (38-8)

''بلکہ یہ میری نصیحت (کی کتاب) سے شک میں ہیں۔ بلکہ انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا''

(د) کفار کے مسلسل معاندانہ رویے اور حق سے اعراض کی روش پر صرف وہی شخص یا گروہ

اصرار کرسکتا ہے جس نے 'تکذیب آیات' کا فیصلہ کررکھا ہو اور اب ہدایت سے محروم ہو چکا ہو اپنی نجی محفلوں میں مشورے کرتے تھے کہ اب آپ ﷺ پر کیا نئی بات کہی جائے۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ O مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ O لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ O قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ O بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ O(21-01تا05)

''لوگوں کا حساب (سزائے اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا ہے اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ظالم لوگ (آپس میں) چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں کہ یہ (شخص کچھ بھی) نہیں مگر تمہارے جیسا آدمی ہے تو تم آنکھوں دیکھتے جادو (کی لپیٹ) میں کیوں آتے ہو۔ (پیغمبر نے) کہا جو بات آسمان اور زمین میں (کہی جاتی) ہے میرا پروردگار اسے جانتا ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ بلکہ (ظالم) کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (میں دیکھ لی) ہیں (نہیں) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے جو اس) شاعر (کا نتیجۂ طبع) ہے تو جیسے پہلے (پیغمبر نشانیاں دے کر) بھیجے گئے تھے (اس طرح) یہ بھی ہمارے پاس کوئی نشانی لائے۔''

قرآن مجید نے اہل مکّہ کی مدینہ کے یہود اور نجران و یمن کے عیسائیوں سے تجارتی روابط اور دوستی کا حوالہ سے انہیں بڑا صائب مشورہ بھی دیا کہ تم پیغمبر کو نہیں مانتے اور 'وحی الٰہی' کو کسی انسان پر آنے کو انوکھا عمل سمجھ رہے ہو تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے ہی پوچھ لو۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (21-07)

''اور ہم نے تم سے پہلے مرد ہی (پیغمبر بنا کر) بھیجے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو جو یاد رکھتے ہیں ان سے پوچھ لو۔''

مگر اہل مکہ پر ان نصیحتوں اور پیغمبر ﷺ کی دلسوزی کا کوئی اثر نہ ہوا اور تکذیب کا عمل آگے ہی بڑھتا رہا اور 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق آپ ﷺ کے مزید سمجھانے پر وہ دعوتِ حق سے مزید بدکتے تھے اور دور بھاگتے تھے۔ ارشاد ہے

فَمَا لَهُمۡ عَنِ التَّذۡكِرَةِ مُعۡرِضِيۡنَ O كَاَنَّهُمۡ حُمُرٌ مُّسۡتَنۡفِرَةٌ O فَرَّتۡ مِنۡ قَسۡوَرَةٍ O بَلۡ يُرِيۡدُ كُلُّ امۡرِئٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ يُّؤۡتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً O كَلَّا بَلۡ لَّا يَخَافُوۡنَ الۡاٰخِرَةَ O (75--50-55)

''ان کو کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں گویا گدھے ہیں کہ بدکے ہوئے (جیسے) شیر سے ڈر کر بھاگے ہیں اصل یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس کھلی ہوئی کتاب آئے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو آخرت کا خوف ہی نہیں۔''

(۹) ہر انسان کے فارغ اوقات کے کچھ مشغلے ہوتے ہیں۔ اجتماعی سطح پر یہ مشغلے کھیلوں اور دیگر مشاغل (SPORTS) کے نام پر ہر برادری قوم اور ہر علاقے کے لوگوں کو شناخت دیتے ہیں۔ پھر یہی مشاغل اور کھیل کود کے طریقے (MEANS OF ENTERTAINMENT) ہر دور میں زمانے کی ترقی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو مشاغل الیکٹرانک میڈیا کے نام سے گلی گلی اور کوچے کوچے لوگوں کو مصروف رکھے ہوئے ہیں اور چھوٹی سکرین اور بڑی سکرین پر لوگوں کی ذہنی عیاشی اور لہو ولعب کا سامان مہیّا کرتے ہیں آج سے چودہ صدیاں قبل عرب میں اس کی شکلیں ذرا مختلف تھیں۔ شعراء شاعری کرتے تھے اور میلوں ٹھیلوں میں خطیب، ہجو گو شاعر، یا وہ گوئی کرنے والے مزاحیہ کردار، دوسروں کی نقلیں اُتارنے والے، ناچنے گانے کا پیشہ کرنے والی عورتیں آج کی طرح پہلے زمانے میں بھی لوگوں کی تفریح طبع کا سامان تھا۔

رؤسائے مکہ اپنے عوام اور اپنے نوجوانوں کے حضرت محمد ﷺ کی دعوتِ حق سے متاثر ہونے سے خائف تھے لہٰذا بدنیتی کی بنیاد پر وہ 'تکذیب' کی بیماری کے تحت ایسے طریقے اختیار کرتے تھے، ایسے لوگوں کی سرپرستی کرتے تھے اور ایسے حربے اختیار کرتے تھے کہ عوام اور بالخصوص عرب نوجوان فارغ اوقات میں ان لغویات کی طرف چاہے متوجّہ ہوں مگر کسی طرح حضرت محمد ﷺ کی دعوت ان کے کان میں نہ پڑے۔ مقصد یہ تھا وہ اس طرح وہ ان کے غلام رہیں ان کی چاکری کرتے رہیں اور ان کی سرداری قائم رہے۔

سورۂ لقمان میں اسی طرح کی ایک مثال دی گئی ہے کہ ایک عرب سردار ملک شام جاکر کچھ سٹیج 'اداکار' عورتوں کا اہتمام کرلایا اس سے اُوپر درج مقصد بھی حاصل ہوگیا اور مالی منفعت بھی ہوگئی۔ ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا

''اور لوگوں میں بعض ایسا ہے جو بے ہودہ حکایتیں خریدتا ہے تاکہ (لوگوں کو) بے سمجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کرے اور اس سے استہزاء کرے''

یہ تکذیب کے ضمن میں کسی شخص کی طرف سے حق کی راہ میں روڑے اٹکانے کی بدترین مثالوں میں سے ایک ہے۔

(د) دعوتِ حق کو عیب لگانا (يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا)

انگریزی محاورے میں LAST BUT NOT THE LEAST کے مصداق تکذیب کے نفسیاتی مریضوں کی طرف سے آخری اور سب سے بڑا حربہ ایسے خطیبوں اور مقررین کی کھیپ مہیا کرنا بھی تھا جو 'دعوتِ حق' اور اس کے 'داعی' کی ذات میں عیب لگائیں اور اس کا مذاق اُڑائیں۔

یہ 'منحوس' کام اپنی برائی اور فطری نحوست کی وجہ سے کیوں بُرا ہے؟ اس کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے تاکہ مدعا واضح ہوسکے۔ عام قاری اور مسلمان اس بات کو بڑا ہلکا سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ کام سراسر بدنصیبی اور سیاہ بختی کا حامل ہے۔

دعوتِ حق اور داعیٔ حق پر عیب لگانا

(i) اللہ تعالیٰ کی ذات بے عیب ہے اس کی ذات میں تو کیا عیب تلاش کئے جائیں گے وہ 'سبوح'، 'قدوس' منزّہ عن الخطاء اور ہر طرح کے عیوب بلکہ اس کے پرتو سے بھی پاک اور بہت بلند و برتر ہے اس کی تخلیق کردہ کائنات میں کوئی عیب تلاش کرنا (67-03) ناممکن ہے اس کی ذات تو اس سے کہیں وراء اور وراء الوراء ہے۔

(ii) اللہ تعالیٰ کے فرستادہ تمام پیغمبر علیہم السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی انسان تھے تمام بشری کمزوریوں سے پاک۔ پیغمبروں کا کردار عام انسان کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ بلند، پاکیزہ، بے عیب، مثالی تھا کہ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اسی لئے جن حضرات کو لوگ انبیاء علیہم السلام کا درجہ دیتے ہیں اُن کے لئے معصومیت ایک لازمہ ہے اور یہ بات منطقی اور عقلی طور پر بھی قابل لحاظ ہے کہ جن ہستیوں انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے معبوث فرمایا اور لوگوں کی رہنمائی کے منصب پر فائز فرمایا (جن میں پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) ان کی شخصیتوں میں بھی بشری کمزوریاں اور کردار کی خامیاں ہوں تو 'اندھا دوسروں کی کیا رہنمائی کرے گا اور نمونہ بنے گا' کے مصداق وہ دوسروں کے لئے 'اُسوۂ کامل' اور نمونہ اور مثالی یا IDEAL شخصیت کیسے قرار پا سکتے ہیں۔

لہٰذا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام معصوم عن الخطاء اور بے عیب شخصیّات کے مالک ہوتے تھے۔ ان کے کردار بے داغ تھے اُن کی زندگیاں بالعموم اور جوانی (کے دور میں) بھی ہر قسم کی بے راہ روی سے پاک اور برائی سے دور تھے قرآن پاک میں بطور نمونہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال اُصولی طور پر سب انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے کفایت کرتی ہے۔

(iii) دعوتِ حق اور اس کا پیغام جو قرآن مجید کی شکل میں تھا اور آج بھی موجود ہے اپنے متن کے ساتھ۔ وہ دعوت اور پیغام اور کتاب بھی ایک 'نادر کتاب' ہے اور اس میں باطل کبھی داخل نہیں ہو سکتا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور نہ بعد میں (41--41-42)۔

دعوتِ حق فطری داعیات اور ضمیر انسانی کی پکار کی تعمیل کا نام ہے اور بنیادی باتیں آج بھی اور حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں بھی فطرتِ انسانی کی آواز اور احساسات کا ہی دوسرا نام تھا۔ سچ بولنا، وعدہ وفا کرنا، ظلم نہ کرنا، کسی کی عزت پر حملہ نہ کرنا، ناپ تول کے پیمانے پورے رکھنا،

ملاوٹ نہ کرنا، بے حیائی سے اجتناب، دوسروں کی عیب جوئی اور کردار کشی سے اجتناب ایسے کام ہیں جو ہر پاکیزہ دل اور باضمیر شخص کے دل کی آواز ہیں اور یہی دعوتِ حق کی بنیاد ہے۔ معرفت الٰہی، توحید کا کردار، اللہ کا رب ہونا یہ وہ فطری تقاضے ہیں جو قلب انسانی میں نقش ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی دعوت میں اور ان کی ذاتی شخصیت میں کوئی عیب نہیں تھا۔

اب آیئے اہل مکہ کی 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کے شیطانی اور ابلیسی عمل کی حقیقت کی طرف کہ اس کی حقیقت کیا تھی؟

عام سرداروں، باحیثیت افراد، راجوں، مہاراجوں بادشاہوں کی زندگیوں پر عیب لگانے کی بات ہو تو معاملہ آسان ہے ایک ڈھونڈھو ہزار ملنے والی بات ہے جس طرح کے چاہو عیب لگاؤ زندگی کے جس شعبے میں چاہو گھس جاؤ بات بنانے کو موقع مل جائے ظاہر عیوب ہوں یا باطنی ہر طرح کا مواد اکٹھا کیا جا سکتا ہے مگر اہل مکّہ کی بدقسمتی یہ تھی (اور یہی بدنصیبی ہر اُس شخص کا بھی مقدّر رہے جو اللہ، قرآن مجید اور قرآن مجید کے لانے والے سیدنا حضرت محمد ﷺ) کہ اسلام میں عیب لگانا ممکن نہیں ہے کہ کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس کیسے عیب لگائے گا۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے لہٰذا یہ کلام بھی بے عیب کلام ہے۔ یہ صرف عقیدہ کی بات نہیں اس کلام کے داخلی محاسن اور ظاہری محاسن حد سے باہر ہیں اس کے حروف کی تعداد معیّن ہے اس میں دنیا اور آخرت کے جوڑے الفاظ کی تعداد معین ہے لہٰذا یہ کلام بھی موضوع گفتگو اور 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کا نشانہ نہیں بن سکتا اور صاحب قرآن حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی بھی کسی اخلاقی، کاروباری، سماجی گراوٹ اور عیب لگانے کا موقع نہیں دیتی کہ اُن کا کردار ــــ ایک پیغمبرانہ کردار ــــ بھی بے عیب ہے اور خلقی اعتبار سے بھی 'خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْب' کا مصداق کامل ہے۔ (یہ مصرعہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ہے)

لہٰذا پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کا جو عمل مکہ کے ہر سردار کے ڈیرے یا اوطاق پر ہوتا ہے اور ہر سماجی اجتماعی اور رسمی، غیر رسمی اکٹھ کے موقع پر موضوع سخن بنتا تھا ــــ وہ سب کا سب 'جھوٹ' ہوتا تھا۔ لہٰذا بے بنیاد تھا اور بے حقیقت اور بے وقعت اور اس کا

کوئی جواب دینا چنداں ضروری نہیں کہ وقتی طور پر محسوس تو ہوتا ہے کہ 'جھوٹ' کا طوفان باندھ دیا گیا ہے اور پراپیگنڈے کی آندھی ہر چار سو پھیل گئی ہے مگر ہر باطل کی طرح یہ عمل بھی بے بنیاد ہونے کی بنیاد پر جلد ہی خود کافور ہو جاتا تھا اور حق کا چہرہ اس گرد و غبار سے صاف ہو کر پہلے سے واضح اور روشن نظر آتا تھا۔

'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کے اس عمل کی تفصیلات کیا تھیں؟ وہ بھی دلچسپ تھیں

_____ ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ کوئی معقول اور باضمیر شخص بدیہی طور پر جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔ جھوٹ بولنا اور وہ تکرار کے ساتھ مسلسل صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب آدمی کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے یا اس کا ضمیر خرید لیا گیا ہو ایسا انسان ہی اس طرح کا کام کر سکتا ہے اور پھر اس کام کے لئے ضمیر انسانی بڑا بھاری معاوضہ طلب کرتا ہے۔ اہل مکہ نے 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کا مکروہ عمل شروع کر کے سینکڑوں ڈیروں اور اجتماعی بیٹھکوں اور اوطاقوں پر ہزاروں ایسے آدمی مہیا کئے اس کے لئے انہیں مسلسل اپنی جیبوں سے سرمایہ لگانا پڑا۔

_____ اس مکروہ عمل پر گفتگو کے دوران وہ کئی قسم کا جھوٹ بولتے تھے اور باتیں بناتے تھے مثلاً کبھی آپ ﷺ کو شاعر کہتے مگر معاشرہ شاعروں کے مزاج، کردار، معاشرتی حیثیت اور شب و روز کے مشاغل سے واقف تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا کردار ان شعراء سے یکسر مختلف تھا۔

_____ کبھی آپ کو کاہن کہتے، کبھی 'ساحر' یعنی جادوگر کہتے، کبھی آپ پر جنوں کا سایہ بتاتے مگر ہر نئی بات پہلی بات سے زیادہ بے تکی اور بے بنیاد اور آپ ﷺ کی شخصیت و کردار سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

قرآن مجید کے نازل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ ملک شام وغیرہ کے تجارتی سفر کرتے رہے ہیں، وہاں سے تورات انجیل کے علوم سیکھ کر آئے ہیں اور اب خود بیان کر رہے ہیں۔ اس بات کا بھی حقیقت سے تعلق نہیں اگر آپ ﷺ کی معلومات کا SOURCE ہوتا حضرت لوط علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کردار کا وہ نقشہ سامنے آتا جو حزقی ایل نبی کے بارے میں انجیل میں ہے۔ جبکہ قرآن مجید اس قسم کی تمام خرافات سے نہ صرف پاک ہے بلکہ اس کو جھوٹ اور بے بنیاد قرار دیتا ہے۔

_____ کبھی کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے ایک پڑھا لکھا عجمی غلام گھر میں چھپا رکھا ہے اس سے سیکھ سیکھ کر عبارت ہمارے سامنے 'قرآن' بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس بات کا بھی عربی زبان کے ساتھ 'تضاد' کے تعلق کے سوا کوئی تعلق نہیں۔

_____ کبھی آپ ﷺ کو 'مجنوں' کہتے۔ مگر اس بات کے لئے جو بہت سارا مواد چاہئے تھا اس کی عدمِ موجودگی میں ایسا 'الزام' کہنے والے لوگوں کے ضمیر پر خود ہی بوجھ بن کر گرتا تھا اور وہ اس کو لمبے عرصے تک زبان سے نکالنے سے گزیر کرتے تھے یا اتنے بڑے جھوٹ کو بولنے کے لئے بھاری معاوضے طلب کرتے تھے اس لئے کہ عوام کے سامنے (آج کل کے میڈیا کی طرح) جتنا بڑا 'جھوٹ' بولنا ہو اتنا زیادہ اور بھاری معاوضہ درکار ہے۔ اسی بھاری معاوضہ پر اہل مکّہ کا حضرت محمد ﷺ کے خلاف یہ 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کا محاذ کھلا رہا۔ اسی پراپیگنڈے نے جنگ بدر سے فتح مکہ تک مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جنگی بخار کی کیفیت پیدا کیے رکھی۔ اس کا ذکر سورۂ انفال میں یوں آتا ہے:

فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْن (08-36)

''سو ابھی اور خرچ کریں گے مگر آخر وہ (خرچ کرنا) ان کے لیے (موجب) افسوس ہوگا اور وہ مغلوب ہو جائیں گے۔''

اور اسی کا قرآن پاک کی سورۂ آلِ عمران میں (جنگ اُحد سے پہلے) یوں ذکر فرماتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

(اے پیغمبر) کافروں سے کہہ دو کہ تم (دنیا میں بھی) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بُری جگہ ہے۔ (03-12)

قرآن پاک میں 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کی اصطلاح اسی پس منظر کے ساتھ 5 مرتبہ آئی ہے:

1۔ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاءُ (03-99)

''تم مومنوں کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو اور باوجود یہ کہ تم اس سے واقف ہو اس میں کجی نکالتے ہو''

2۔ اَلَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَھَا عِوَجًا وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ کٰفِرُوۡنَ (07-45)

''جواللہ کی راہ سے روکتے اوراس میں کجی ڈھونڈتے اورآخرت سے انکار کرتے تھے''

3۔ وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَتَبۡغُوۡنَھَا عِوَجًا (07-86)

''اور ہر راستے پر مت بیٹھا کرو کہ جو شخص اللہ پر ایمان لاتا ہے اسے تم ڈراتے ہو اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہو.....''

4۔ اَلَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَیَبۡغُوۡنَھَا عِوَجًا وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ کٰفِرُوۡنَ (11-19)

''جواللہ کی راہ سے روکتے ہیں اوراس میں کجی چاہتے ہیں اورآخرت سے بھی انکار کرتے ہیں''

5۔ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَھَا عِوَجًا اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍۢ بَعِیۡدٍ (14-03)

''اوراللہ کے راستے سے روکتے ہیں اوراس میں کجی چاہتے ہیں یہ لوگ پرلے سرے کی گمراہی میں ہیں۔''

اُوپر درج تفصیل سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بالعموم اور قیامِ مکہ کے دوران بالخصوص دشمنانِ اسلام نے ایک خاص قسم کا اسلام دشمن ماحول پیدا کئے رکھا جس کا مسلمانوں نے صبر واستقامت سے مقابلہ کیا اوراللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے کامیابیاں حاصل کیں اور جاء الحق کی کیفیت سامنے آگئی اور 'زھق الباطل' باطل ایسے بھاگا (جہاں جہاں اسلام پہنچا) جیسے وہ تھا ہی نہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ 'مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ' کی اصطلاح کی قرآن پاک سے ہی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اُوپر درج کی گئی ہیں اس کی روشنی میں یہ بات عیاں ہے کہ آج سے ڈیڑھ ہزار

سال قبل بھی اور ہزار سال قبل بھی، پانچ سو سال قبل بھی اور آج بھی جو لوگ بھی اسلام کی مخالفت میں یہ راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اسی طرح خائب وخاسر ہوں گے جیسے اہل مکہ ہوئے تھے۔

گزشتہ پندرہ صدیوں سے اسلام کے مخالفین اور ابلیسی گروہ صہیونیت (یہودیت اور اسکے تابع تثلیثی عیسائیت) نے جو جنگ شروع کر رکھی ہے وہ یہی جنگ ہے، جو مسلسل جاری ہے۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے سربراہانِ مملکت وکسریٰ ایران اور قیصر روم ہرقل اعظم کو اسلام کی طرف دعوت کے خطوط رکھے۔ قیصر روم کے پاس خط پہنچا تو اس نے اس خط کے مندرجات پر گفتگو کے لئے مکّہ سے آئے ہوئے کسی شخص کو ڈھونڈھ کر ملاقات کا فیصلہ کیا حضرت ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور تجارتی قافلہ لے کر یروشلم گئے ہوئے تھے ان کو بلایا گیا اور ہرقل نے آپ ﷺ سے متعلق بہت سارے معقول سوالات کئے جو اس کی اسلام کی حقانیت کی طرف مائل ہونے کی دلیل ہے۔ مگر حکومت و ریاست وسیادت آڑے آگئی، عیسائی مذہبی رہنما غصے میں آگئے اور یوں ہرقل اعظم آپ ﷺ پر ایمان لاتے لاتے رُک گیا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے ہی بخاری شریف میں روایت کی تفصیلات میں ہے کہ اس نے کہا میں ایک نبی آخرالزماں علیہ السلام کا منتظر تھا مگر میں سمجھتا تھا (یہود کے من گھڑت پراپیگنڈے کے مطابق) وہ یورپ میں آئے گا تاہم اگر حکومت کی بیڑیاں نہ ہوتیں تو اس بات کو سعادت سمجھتا کہ مدینہ جا کر اس پیغمبر علیہ السلام کے پاؤں دھوؤں اور خدمت کروں (اور ایمان لاؤں) نیز اس کی حکومت عنقریب اس جگہ (جہاں یروشلم کے علاقہ میں وہ موجود تھا) تک پہنچ جائے گی۔ یہ علاقہ 16ھ میں فتح ہوگیا (اس واقعہ کے روایت کرنے والے حضرت ابوسفیان تو واپس آکر فوراً فتح مکہ سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے) ہرقل کا یوں پہچاننے کے باوجود ایمان نہ لانا اس کو اس کی حکومت کی پورے وسائل سمیت ـــــ 'مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ' کی طرف اور تکذیب اور 'یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کی طرف دھکیل گیا۔ عیسائی مذہبی اور سیاسی قیادت نے عوام کو اسلام سے روکنے کے لئے وہ خرافات یورپ میں پھیلائیں کہ الامان الحفیظ۔ لوگ کہانیاں، محاورے واقعات، ادب، شاعری، افسانے، ناول غرض ہر جگہ اسلام دشمنی کا زہر گھول کر اس ظالم گروہ نے یورپ کو 800 سال اسلام سے برگشتہ رکھا کہ 1453ء میں سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ نے فتح قسطنطنیہ

سے اسلام کا داخلہ مشرقی یورپ میں ممکن بنایا۔ اس عرصہ میں عیسائیوں کا مجموعی مزاج ایسا بن گیا کہ وہ آج بھی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں منفی جذبات رکھتے رہیں اور بچپن سے ہر عیسائی بچہ آپ ﷺ کو نبی تو دور کی بات ہے کوئی اچھا باکردار انسان بھی تصور نہیں کرتا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ کاش ہرقل اس وقت ایمان لے آتا تو یورپ اسی وقت اسلام کے دامن رحمت آجاتا اور سب کے لئے یہ واقعہ باعث سعادت ہوتا۔

بعد میں مستشرقین نے اسلام کو سمجھنا شروع کیا تو ان کے قلم میں اسی زہریلے پراپیگنڈے کا اثر نمایاں ہے۔ خال خال لوگ نکلے اور اسلام کو قرآن وسیرت سے سمجھ کر مسلمان بھی ہوئے مگر ایسے لوگ النادر کالمعدوم کے درجے میں ہیں اور آج بھی مغرب اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کی شکل میں جو عالمی سطح پر میڈیا وار شروع کر کے اسلام کو بدنام کر رہا ہے وہ اسی عمل تکذیب اور 'یُبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کا ماڈرن ایڈیشن ہے۔

ہمارے نزدیک پندرہ صدیاں قبل کا تکذیب کا عمل ہو یا بعد کا یا آج کل۔ اسلام، قرآن مجید، صاحب قرآن حضرت محمد ﷺ اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق جو 'یُبْغُوْنَهَا عِوَجًا' کی شکل میں پراپیگنڈا کیا گیا اور کیا جا رہا ہے وہ سب ماضی میں جھوٹ کا پلندہ تھا، آج بھی ہے اور کل بھی جھوٹ ہی رہے گا۔ رہے گا نام اللہ کا، نہ اہل مکہ رہے، نہ ہرقل رہا، نہ مغرب کے اسلام دشمن افراد رہے، نہ ٹیری جان (TERRY JOHN) رہے گا۔ رہے گا تو نام اللہ کا، جس کی بادشاہی ہمیشہ کی ہے۔ قرآن پاک رہے گا اور حضرت محمد ﷺ کی صداقت کی گواہی دینے کے لئے انسانیت رہے گی، جس کا تذکرہ قرآن پاک میں 'وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ' میں آیا ہے۔ حق حق ہے باطل بے بنیاد اور بے دلیل و بے پا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ

وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ

آمین

مدیر کے نام

1۔ پروفیسر حسن محمود اقبال (سابق پرنسپل، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج جھنگ)

حکمت بالغہ کی ایک گزشتہ اشاعت میں ''نظریاتی نظامِ تعلیم'' پر آپ کی تحریر زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، یہ بڑی فکر انگیز کاوش تھی۔ اس موضوع پر پہلے بھی قلم اُٹھایا گیا ہے تاہم صلائے عام کی ضرورت موجود ہے۔

نظامِ تعلیم کسی ریاست کے اَساسی نظریے سے ہم آہنگ نہ ہو تو ریاست کی بقا ہی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ یہ نظام ہی وہ ''کارگاہ'' ہے جس میں ''ریاست'' کے ''مقدر کے ستارے'' ڈھلتے ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ ''نظریاتی نظامِ تعلیم'' کا خواب بھی اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا جب تک نظریۂ پاکستان میں یقین رکھنے والی ''ہیئت مقتدرہ'' زمامِ کار نہیں سنبھال لیتی۔ یہاں میں آپ جیسے اہلِ نظر کی توجہ ایک اور پہلو کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہمارے نظامِ تعلیم کو اُس موڑ پر لایا جا رہا ہے جہاں اُردو زبان کے بارہ پتھر باہر کر دیا جائے۔ ہر تعلیمی ادارہ ''انگلش میڈیم'' ہونے پر نازاں ہے اور اُردو سے متعلق معذرت خواہ ہے۔ ان اداروں کی ایک قابلِ ذکر تعداد نے تو اپنی حدود میں اُردو بولنے پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔ جو زبان علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی ﷺ، سیّد سلیمان ندوی اور علامہ اقبال کے خطبات، حالی کی مسدّس اور حفیظ کا شاہنامہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے، اُس سے یہ بے اعتنائی کیا گل کھلائے گی۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ مقتدرہ قومی زبان، مجلس زبانِ دفتری، اُردو اکادمی، اقبال

اکادمی اور اکادمی ادبیات پاکستان جیسے ادارے بھی مہر بہ لب ہیں۔

آج اگر بابائے اُردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سید عبداللہ اور وقار عظیم جیسی ہستیاں حیات ہوتیں تو اس سکوت کو ''سکوتِ مرگ'' نہ بننے دیتیں۔ مگر ''اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر'' اُردو زبان کو ذریعہ تدریس بھی ہونا چاہئے اور ذریعہ اظہار بھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کسی پلیٹ فارم پر ''اُردو بچاؤ سیمینار'' منعقد کیا جائے جس میں ماہرین اس تضاد پر اپنی رائے دیں کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا تو قومی زبان کی اہمیت کا ادراک رکھتا ہے مگر تعلیم و تعلّم سے وابستہ ادارے اسے ثانوی اہمیت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں نجی شعبہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آیئے نظامِ تعلیم میں اُس زبان جو جائز مقام دلائیں جو ہمارے تہذیبی ورثے کی امین ہے۔ شکریہ

2۔ پروفیسر محمد حمزہ نعیم (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ)

مہد الفقیر الاسلامی میں نفلی اعتکاف کیا تھا واپس پہنچا تو آپ کا حکمت بالغہ نظر نواز ہوا اور آج ایک ہی نشست میں قبل دوپہر سے بعد ظہر تک (سوائے نماز کے) کئی گھنٹے میں آپ کا مقالہ ''اسرائیل اور اس کے اتحادی'' نہایت عقل و فکر کی گہرائی سے پڑھا۔ پہلے بھی آپ کے مقالات میں گہرائی اور اُمت کی فکر نظر آیا کرتی ہے۔ موجودہ مقالے میں تو آپ نے چشم کشا حقائق کو عیاں کر دیا ہے۔ دُعا ہے کہ اُمت کو آپ کی فکر اور آپ کی دردمندی سے اللہ کریم بھرپور فیضیاب کرے۔

دوسرے اسلامی ممالک کا تو علم نہیں مگر پاکستان کے نصابِ تعلیم میں سے واقعتاً اسلاف کے جہادی کارنامے اور جہادی آیاتِ قرآنی کو نکال دیا گیا ہے۔ 1998ء کے بعد مسلسل مگر آہستگی سے یہ کام کیا جاتا رہا اس میں بلوچستان کی زبیدہ نامی سابق وفاقی وزیر تعلیم کی کارکردگی کو امریکہ نے خوب سراہا تھا مگر اس کے بعد پنجاب میں شریف حکومت نے بھی چند پچھلے برسوں میں خوب حصہ ڈالا ہے۔ مثلاً الیکشن 2013ء سے پہلے حکومت تحلیل ہونے سے قبل شہباز شریف حکومت میں نصاب میں سے بہت کچھ نکال دیا گیا۔ مگر استعفیٰ دینے سے پہلے شہباز شریف نے مگرمچھ کے آنسو بھی بہائے اور فوری طور پر کمیٹی بنانے کا اعلان کر دیا کہ وہ تفتیش کر کے ذمہ داروں کی نشاندہی کرے مگر اہل علم و فہم تو جانتے تھے کہ یہ اعلان صرف عوامی ردِعمل سے بچنے کے لیے تھا

پھر وہ الیکشن بھی جیت گئے۔ پورے ملک میں وفاق اور صوبہ پنجاب میں ان شریفوں کی حکومتیں بن گئیں مگر نہ کمیٹی کا کھوج ملا، نہ ہی بنی، اور نہ ہی اصحابِ نبی اور نامور اسلاف اسلام کا ذکر واپس آسکا۔ البتہ انڈیا کو پسندیدہ ترین ملک قرار دینے کی طرف خوب تیز روی دکھائی جارہی ہے۔ جبکہ انڈیا اپنے کردار سے انہیں بُجّے دکھا رہا ہے۔ اللہ سے دُعا ہے اللہ ہمارے حکمران طبقے کو فراست مومن نصیب فرمائے۔ آمین

ہجرتِ نبوی کے موقع پر مدینہ کے تینوں یہودی قبائل کا مختصر مگر مناسب ذکر آپ نے کر دیا ہے۔ غزوۂ احزاب (NATO FORCES) کے موقعہ پر خندق کھودنے کو آپ نے نبوی حکمت عملی کا شاہکار قرار دیا ہے حقیقت بھی یہی ہے۔ سیّدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی عظمت اور فدائیت اپنی جگہ مگر ان سے منسوب مشورہ اس لئے درست معلوم نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے روایت کے مطابق عرض کیا تھا کہ دشمن کے مقابلے میں ہم ایرانی لوگ ایسے ہی خندقیں کھود لیتے تھے حالانکہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پوری عمر بھر ایران پر کوئی ایسا حملہ نہ ہوا۔ جس میں خندق کھودنی پڑی ہو۔ یہ ایک گپ ہے جو کسی سازش کے تحت حکمت نبوی کی عظمت کو گھٹانے کے لئے گھڑی گئی۔ اللہ آپ کو بہت جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

اہل ایمان پہلے ہی ان اطلاعات پر سخت پریشان ہیں جو آپ نے بھی لکھا کہ سعودی عرب کا (عراق کا خوف دلا کر) احاطہ کرلیا گیا ہے اور جمہوریت کا راگ آلاپنے والے سعودی بادشاہوں سے یاری گانٹھنے والے جب مصر میں کسی مسلمان بندے کو صدر دیکھتے ہیں تو اپنے یہودی ایجنٹ فوجیوں کے ذریعے وہاں سو فیصد جمہوریت سے برسراقتدار آنے والے مردِ مومن مرسی کو گرفتار کر کے کال کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ سعودی عرب سمیت تمام مسلمان ممالک کے حکمران بشمول شریفین خاموش نظر آتے ہیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اربوں کھربوں ڈالر کی تمام رقوم عرب حکمرانوں کی یورپ و امریکہ کے یہودی بنکوں میں جمع ہیں وہ جب چاہیں ان غلام حکمران کو انگوٹھا دکھا دیں۔ ہمیں تو اس کا خطرہ بہت جلد نظر آرہا ہے۔ اللہ اہل اسلام کی حفاظت فرمائے۔ آمین

یہ بات بھی عجیب ہے کہ ''علی اللہ'' حضرت علی ہی اللہ ہیں کا نعرہ لگانے والے نصیریوں

کے خلاف تحریک چلی ہے تو اثنا عشری ایران اور حزب اللہ جو ''علی اللہ'' کا نعرہ لگانے والوں کو کافر کہتے ہیں' اب خود انہی کے فوجی دستے ہزاروں مسلح دستوں کی شکل میں ان نصیروں کی مدد میں فرنٹ لائن پر سنی مجاہدین شامیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ یورپ نے سیکولرتر کی کی 100 سال سے منّت خوشامد کے باوجود انہیں یورپی اتحاد میں شامل نہیں کیا اور اب تو کسی حد تک اسلام کی نام لیوا حکومت ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ شرک کے نام پر مقدس مقامات کی بے حرمتی مسلسل جاری ہے۔ غارِ حرا اور غارِ ثور پر جانے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کئی مساجد صرف اس لئے گرادی گئیں کہ یہ کسی نہ کسی صحابی کے نام سے منسوب تھیں۔ سعودی حکمران شرک سے بچانے کی دوسری کوششیں بھی کر سکتے تھے مگر آپس میں اختلاف پیدا کر رہے ہیں ابھی دیکھیں 28/رمضان کی شام چاند ڈھونڈنے کا اعلان کر دیا گیا اور 29/رمضان 7/8 کی شام رؤیت کا اعلان حالانکہ 7/8 کی شام پوری آباد دنیا میں چاند نظر آنا ناممکن تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ضرور یہودی سازشوں کا حصہ ہے۔ نہ اعتکاف درست ہوا، نہ قربانی، نہ حج۔ سعودی اہل علم بھی اب اس بات کے خلاف احتجاج ریکارڈ کرا چکے ہیں۔ آپ نے آخر میں احادیث پاک میں بدخواہانِ اسلام کی مساعی نامشکورہ کا ذکر فرما کر ہمیں تڑپا دیا ہے۔ اللہ پاک اسلام اور مشاعر اسلام کی خود حفاظت فرمائے اور مدعیانِ اسلام کو عامل بالاسلام محبانِ اسلام بنائے۔ شکریہ

تعارفِ جرائد ماہنامہ **الجامعہ**، جامعہ محمدی شریف (چنیوٹ)

اتحاد عالم اسلام کا نقیب، پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کا اوّلین ترجمان اور رکن کونسل آف جرائد اہلسنّت پاکستان، ماہنامہ ''الجامعہ'' جامعہ محمدی شریف (چنیوٹ) 65 سال سے مسلسل اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ جس کے مدیر اعلیٰ ہیں جناب مولانا محمد رحمت اللہ صاحب اور چیف ایڈیٹر ہیں جناب سیّد انور قدوائی صاحب۔ زرسالانہ -/400 روپے، فی شمارہ 40 روپے۔

ملنے کا پتہ ماہنامہ الجامعہ۔ جامعہ محمدی شریف، ضلع چنیوٹ 0476-322212

پاکستان میں حالیہ طوفانی بارشوں اور سیلاب کے پس منظر میں ایک دُعا

یااللہ پاکستان میں حالیہ طوفانی بارشیں، سیلاب اور ناگہانی مصیبتیں اگر تیرے علم کامل کے مطابق تیرا ہی فیصلہ ہیں تو ہم تیرے غضب اور ناراضگی سے تیری ہی پناہ چاہتے ہیں اور اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں۔

اور اگر یہ طوفانی بارشیں، سیلاب اور ناگہانی مصیبتیں تیرے علمِ کامل میں تیرے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے فرمان کے مطابق فتنۂ دجال کا حصہ ہیں کہ دجال جہاں چاہے گا بارش برسا دے گا اور جہاں چاہے گا خشک سالی پیدا کر دے گا تو ہم ان کے شر سے بھی تیری پناہ چاہتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ تو ان تمام ناگہانی مصیبتوں کا رُخ ان کے منصوبہ سازوں کے اپنے علاقوں، سرزمینوں اور آبادیوں کی طرف پھیر دے اور ہمیں ان کے شر سے محفوظ فرما۔

آمین ــــــ یاربّ العالمین

سیّدنا حضرت **محمد** ﷺ

پر درود وسلام بھیجنا ایک مسلمان کے لئے سعادت دارین ہے

لیکن

- صلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے؟
- سلام بھیجنے سے مراد کیا ہے؟
- صلوٰۃ وسلام بھیجنے کے لئے آپ ﷺ کا بتایا ہوا طریقہ کیا ہے؟
- صلوٰۃ وسلام کس کس موقع پر پڑھنا چاہئے؟
- توہین رسالت کے واقعات کے پس منظر میں صلوٰۃ وسلام کی کیا اہمیت ہے؟

یہ اور دیگر ایسے سوالات کے جوابات کے لئے

ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ ان شاءاللہ

اکتوبر 2013ء میں

خصوصی اشاعت

کا اہتمام کر رہا ہے

جس کا عنوان

الصّلٰوۃ والسّلام علٰی رسولِ اللّٰہ

ہوگا۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ اس خصوصی اشاعت کے لئے قلمی تعاون فرمائیں نیز موضوع سے متعلق تراشے حوالہ جات اور مضامین ارسال فرمائیں یا مطلع فرمائیں

(ادارہ)

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اور قیامِ پاکستان

سے پہلے وفات پا جانے والی

21 اسلامی انقلابی شخصیات

حصہ اوّل حصہ دوم حصہ سوم کے بعد

اب تینوں حصوں کا مجموعہ طباعت کے آخری مرحلہ میں ہے

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

زیرِ انتظام انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ 047-7630861